ہفت روزہ

الفتح

کراچی

۱۶-۲۳ نومبر ۱۹۷۲ء

شمالی ویت نام اور شمالی کوریا سے
پاکستان کے تعلقات کا نیا باب

قیمت :— ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے :— ۷۵ پیسے

سیّد عبدالحمید عدمؔ



سچّی باتیں

زبان بندی

خونِ انصاف کا — کرنے کی ضرورت ہو جب
ہونٹ دولت سے گواہوں کے — سِئے جاتے ہیں

ٹھہراؤ

تری جدائی کے لمحے — بسر نہیں ہوتے
اگرچہ وقت — بہت تیز گام چلتا ہے

فرمان

یہ حکم نشر کرا دو عدمؔ — کہ آئندہ
عوام تن کے چلیں — جھک کے شہریار چلے

سخاوت

سرزد ہوئی جو مستی — بزرگانِ دین سے
وہ بھی مرے حساب میں — اِرقام ہو گئی

معذرت

شیخ جی آپ — خُلد میں جائیں
میکدے میں — عوام پیتے ہیں

مماثلت

رکھ دیا مُنہ اس کی گردن پر — صراحی کی جگہ
بیخودی میں — بھول کتنی خوبصورت ہو گئی

پیش بندی

جُرم کی رغبت بہت ہی جس میں کم پائی — اُسے
حوصلہ افزائی کی خاطر — سزا دے دی گئی

اعتراف

دروغ گوئی اگر — شرط ہے فراست کی
تو صاف عیاں ہے — کہ میں صاحبِ شعور نہیں

چور بازار

وہاں کیا کوئی چیز — سستی ملے گی
جہاں تہمتوں کی بھی — مہنگائیاں ہیں

زُود فہمی

گلستاں سب کا سب — جب بجلیوں نے پھونک ڈالا ہے
تو پھر تھوڑی سی — فہمِ باغباں تک بات پہنچی ہے

سرد مہری

نہ سینے سے لگنا — نہ لب جوڑنا
یہ کیا دوستی ہے — یہ کیا پیار ہے؟

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

مدیر
وہاب صدیقی

۱۶ — ۲۳ نومبر ۱۹۷۲ء

قیمت : —— ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے : —— ۷۵ پیسے

جلد — ۳ شمارہ — ۲۷

اداریہ

الفتح ان ہتھکنڈوں سے مرعوب نہیں ہوگا

صحافت ایک مقدس پیشہ ہے اور صحافی ملک کے سب سے بیدار حلقوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ایک صحتمندانہ سیاسی ماحول کے ارتقاء کے لیے آزادیٔ صحافت ایک بنیادی شرط ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک کی روایات میں صحافت کو ہمیشہ چند مخصوص طبقوں کے مفادات کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے جس ملک میں تحریر و تقریر کے حق کو سلب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ ملک کبھی پنپ نہیں سکتا۔

قیام پاکستان کے بعد سے اب تک سینکڑوں صحافیوں کو حق گوئی کے جرم میں سزا مل چکی ہے اب تک یہاں متعدد پارٹیاں برسرِاقتدار آ چکی ہیں اور ہر شہریار کا وطیرہ یہی رہا ہے کہ اگر کہیں سے کوئی آواز اٹھتی ہے تو اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک کسی بھی دور میں ہمارے پریس کو صحیح معنوں میں آزادی میسّر نہیں آ سکی۔ صحافی عوام کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں، اور اگر ان کی آواز کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ برسرِاقتدار طبقہ عوام کے احساسات سے خائف ہے اور اس میں اتنی سکت نہیں کہ وہ ان کے مطالبات کی تکمیل کر سکے۔

برسرِاقتدار طبقے پریس کو ایک مشینی عمل میں ڈھالنے کے لیے اور اسے ایک مخصوص راہ پر چلانے کے لیے ہر ممکن ہتھکنڈے استعمال کرتے رہے ہیں اور آج بھی وزیرِ اطلاعات و نشریات مولانا کوثر نیازی کی سرپرستی میں اسی شدّت کے ساتھ انہی پرانے ہتھکنڈوں کے ذریعے پریس کو کچلنے کی مذموم کوشش کی جا رہی ہے۔ جن حق گو صحافیوں نے رجعت پسند قوتوں کے خلاف پیپلز پارٹی کو، اس کے منشور کی بنیاد پر، عوام میں مقبول کرایا تھا، آج ان سے مجرموں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اگر کوئی اخبار صحت مندانہ اور مثبت انداز میں بھی برسرِاقتدار طبقوں کی بدعنوانیوں کو بے نقاب کرتا ہے تو مولانا کوثر نیازی کا پارہ چڑھ جاتا ہے اور اس اخبار کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا جاتا ہے اور تمام سرکاری، نیم سرکاری اور نجی اداروں کو یہ ہدایت جاری کی جاتی ہے کہ وہ اس اخبار کو اشتہارات دینا بند کر دیں۔ اختلاف رکھنے والے اخبارات کو ان کی ضروریات کے مطابق نیوز پرنٹ فراہم کرنے سے گریز کیا جاتا ہے، انہیں اس

خاص مضامین

فون: ۴۱۲۲۷۴

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح - ۸۷ ڈی، نرسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا

بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ عوام کو حقائق سے آگاہ نہ کریں۔ مثال کے طور پر اس بار جب کراچی کے مزدوروں نے ہڑتال کی تو اخبارات کو واضح طور پر اس بات کی ہدایت کی گئی کہ وہ حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے عوام کو یہ تاثر دیں کہ ہڑتال بالکل ناکام ہو چکی ہے اور تمام کارخانے کھلے ہوئے ہیں۔

مولانا کوثر نیازی کی وزارتِ اطلاعات ونشریات "الفتح" کے خلاف بھی اسی قسم کے مذموم ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہے۔ وزارتِ اطلاعات ونشریات کی طرف سے "الفتح" کے سرکاری اشتہارات بند کر دیئے گئے ہیں اور اصرار کے باوجود ابھی تک سرکولیشن کا آڈٹ سرٹیفکیٹ جاری کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے۔ اسی باعث ہم "الفتح" کی قیمت میں اضافہ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ مولانا کوثر نیازی اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس طرح "الفتح" سسک سسک کر مر جائے گا۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں کہ وہ عوام جو پیپلز پارٹی کے برسرِاقتدار طبقوں کی موجودہ پالیسیوں سے بیزار ہو چکے ہیں، "الفتح" کے ساتھ ہیں۔ جب تک عوام "الفتح" کے ساتھ ہیں اور جب تک "الفتح" عوام کے احساسات کی ترجمانی کرتا رہے گا، اس وقت تک وزارتِ اطلاعات ونشریات کے ہتھکنڈے اس پر کارگر نہیں ہوں گے۔

دوسری طرف اقربا نوازی آج بھی زوروں پر ہے۔ مولانا کوثر نیازی کے اخبار "شہاب" کا پرنٹ آرڈر ۳۵ سو ہے۔ معلوم نہیں کہ اتنا چھپتا بھی ہے یا نہیں، کیونکہ پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں اس کی کُل ۲۵ کاپیاں آتی ہیں۔ مولانا کوثر نیازی کے ترجمان "ویکلی پیپلز" مورخہ ۳ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کے مطابق شہاب کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ سترہ ریم فی ہفتہ ہے۔ "شہاب" کل چھ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ تعدادِ اشاعت کے اعتبار سے اس میں زیادہ سے زیادہ نو ریم لگتے ہیں اور باقی آٹھ ریم فاضل بچتے ہیں۔ یہ دوسرے اخبارات کی حق تلفی نہیں ہے تو کیا ہے؟

وزارتِ اطلاعات ونشریات کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ پریس کے خلاف اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر کے حق کی آواز کو دبا نہیں سکتی۔ وزارتِ اطلاعات و نشریات میں اتنا حوصلہ ہونا چاہیئے کہ وہ بےلاگ تنقید کو ہضم کر سکے۔ پریس کے ذریعے کھوکھلا پروپیگنڈہ کر کے کسی بھی حکومت کو مضبوط نہیں کیا جا سکتا۔ ایوب شاہی دور میں پریس کے ذریعے اسی قسم کا پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا اور حق گو صحافیوں کو پابہ زنجیر کیا جاتا تھا۔ عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی تھی کہ چاروں طرف "امن" برس رہا ہے لیکن بیساکھیوں پر کھڑی ہوئی یہ حکومت دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر آ رہی۔

ہم وزارتِ اطلاعات و نشریات کو اس بات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ حق گو صحافی اپنے فرائض سے منہ نہیں موڑیں گے، ہم ہر آزمائش پر پورے اترے ہیں اور ہر آزمائش پر پورے اتریں گے۔ ہم عوام کی آواز ہیں اور عوام کی آواز کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں کچل سکتی۔

دوستی کی نئی منزلیں

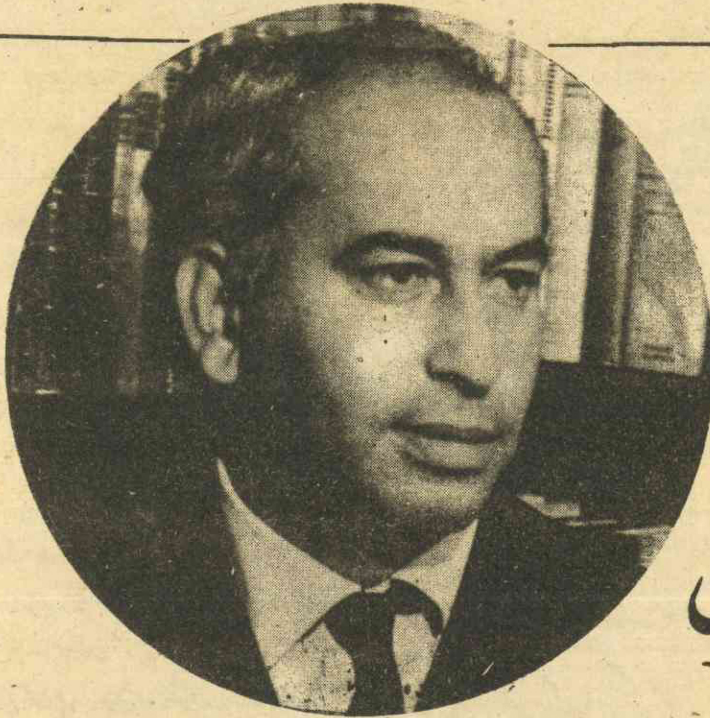
حکومتِ پاکستان نے پچھلے دنوں شمالی ویت نام اور شمالی کوریا سے سفارتی تعلقات قائم کر کے اپنی خارجہ پالیسی میں ایک مثبت رجحان کا اظہار کیا ہے۔ ہم اس خوش آئند تبدیلی کا خیرمقدم کرتے ہیں۔ ہم ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ پاکستان کو کسی بڑی طاقت کے دباؤ میں آ کر اپنے جیسے چھوٹے ممالک سے تعلقات بگاڑنے نہیں چاہئیں۔ شمالی ویت نام اور شمالی کوریا کے عوام ایک طویل عرصے سے سامراج کے خلاف ثابت قدمی اور بہادری سے جدوجہد کر رہے ہیں اور ہمارے عوام جلسے اور جلوسوں کے ذریعے ان کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ ہماری تاریخ کا بہت بڑا المیہ تھا کہ ہماری حکومتوں نے بڑی طاقتوں کے اشارے پر ان دونوں ممالک سے سفارتی تعلقات قائم نہیں کیے۔

پاکستان بڑی طاقتوں سے دوستی کر کے دیکھ چکا ہے۔ اب ہمیں اس بات کا احساس ہو جانا چاہیئے کہ ہمارے اصل اتحادی وہ چھوٹے چھوٹے ممالک ہیں جو ہماری طرح سامراجی استحصال کا شکار ہیں۔ ہمیں ان ممالک سے دوستی کو مضبوط بنانا چاہیئے تاکہ ہم اپنی مجموعی قوت سے سامراجی ہتھکنڈوں کو ناکام بنا سکیں۔ اس کے علاوہ ہمیں دوسرے ممالک کی تحریکاتِ آزادی کی کھل کر حمایت کرنی چاہیئے۔ اگر ہم اب بھی مصلحتوں کا شکار رہے تو یہ اس بات کی علامت ہو گی کہ ویت نام اور شمالی کوریا سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کسی اصول پر مبنی نہیں ہے۔

سیٹو سے نکلنے کا فیصلہ بھی قابلِ تحسین ہے۔ لیکن یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ "سینٹو" میں رہنے پر کیوں اصرار کیا جا رہا ہے۔ اگر ہم امریکی دباؤ سے نکلنا چاہتے ہیں تو ہمیں "سینٹو" سے بھی نکلنا ہو گا۔ سیٹو سے نکلنے کا فیصلہ جس اصول کی بنیاد پر کیا گیا ہے، اسی اصول کی بنیاد پر پاکستان کے عوام کو سینٹو کے مذموم بلاک سے بھی چھٹکارا دلایا جائے۔

احوالِ واقعی

صدر بھٹو کے قریبی مشیر امریکی لائن دے رہے ہیں



پیپلز پارٹی کے کارکن کنونشن میں دوٹوک فیصلے چاہتے ہیں

واقفِ حال

پاکستان نے سیٹو سے باقاعدہ علیحدگی اختیار کر لی ہے اس کے علاوہ شمالی کوریا، شمالی ویت نام کی عوامی جمہوری حکومتوں کو تسلیم بھی کر لیا ہے۔ شمالی کوریا کے تجارتی قونصل خانے تو یہاں پاکستان میں موجود تھے۔ لیکن سفارتی سطح پر کوئی رابطہ نہ تھا اب وہ بھی قائم ہو جائے گا۔ شمالی ویت نام سے ہمارے کسی قسم کے بھی تعلقات نہ تھے، حالانکہ پاکستان کے عوام شمالی ویت نام کی بہادری اور جرأت کے ہمیشہ معترف رہے ہیں اور ویت نام کے مظلوم عوام کی حمایت میں پاکستان میں آج تک بے شمار مظاہروں میں اپنی محبت اور عقیدت کے جذبات کا اظہار کیا گیا۔

اس وقت سیاسی پالیسی کچھ بھی ہو، لیکن یہ تینوں فیصلے بہرحال درست فیصلے ہیں۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ امریکہ اس وقت ویت نام میں جنگ بند کرنے کی سوچ رہا ہے۔ صدر نکسن کے خصوصی مشیر ڈاکٹر کیسنگر پیرس میں شمالی ویت نام کے وفد سے خفیہ بات چیت کر چکے ہیں۔ اس میں بنیادی شرط یہ ہے کہ امریکہ شمالی ویت نام کی حکومت کو بھی قانونی حکومت تسلیم کر لے گا۔ چونکہ ہم صدر نکسن سے اچھے تعلقات کے دعویدار ہیں اس لیے عام طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ فیصلے امریکہ کے دباؤ پر کیے گئے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر فیشن ایبل سوشلسٹوں کا ہے اور امریکہ نواز حلقے مثلاً جماعتِ اسلامی وغیرہ کا کہنا ہے کہ یہ فیصلے روس کے دباؤ پر کیے گئے ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے ترجمان روزنامہ "جسارت" میں ایک طویل مضمون اس سلسلے میں نکلا ہے۔ انہوں نے کھل کر تو نہیں لیکن سیٹو سے نکلنے کا افسوس کیا ہے اور "سینٹو" سے نکلنے سے بھی خبردار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ بھارت کے دباؤ پر کیا جا رہا ہے۔ ان سب کو مسکت جواب اقوام متحدہ میں چین کے نمائندے کی تقریر سے مل جاتا ہے جس نے ان تینوں فیصلوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ امید بھی ظاہر کی ہے کہ پاکستان کو ایشیا میں ایک نہایت عظیم کردار ادا کرنا ہے۔

صحیح سمت میں یہ فیصلے کسی بھی وقت کیے گئے ہوں، بہرحال ایسے فیصلے ہیں جو ایک عرصہ سے متوقع تھے اور ان پر عملی قدم اٹھانا ضروری تھا —— یہ فیصلے ہو گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مختلف حلقوں نے مختلف تاویلات شروع کر دی ہیں۔ کچھ حلقے تو صدر نکسن کی کامیابی پر بڑے اطمینان کا اظہار کر رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ اب پاکستان سیم و زر کی بارش میں نہا جائے گا، بے شمار اسلحہ ملے گا اور پھر کوئی غم نہیں رہے گا —— اور یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ پاکستان اب سب کچھ امریکہ کے سپرد کر دے۔ امریکی فوجی اڈے بھی قائم کر دیئے جائیں۔ اس کے لیے صدر بھٹو پر پورا دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کے زمیندار اور سرمایہ دار جو صرف اقتدار کے حصول کے لیے پارٹی میں شامل ہوئے تھے، وہ ان میں پیش پیش ہیں۔ اور امریکی امداد کے حصول کے لیے ہر ممکن زور ڈال رہے ہیں۔ کمیونسٹوں کے خلاف شعلہ بیانی بھی اس مہم کا حصہ ہے۔ یہ حلقہ اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے پوری سرگرمی سے کوشاں ہے۔

پیپلز پارٹی کی حکومت اور مرکزی کمان میں بھی اس تضاد کا کھل کر اظہار ہوتا ہے۔ دونوں حلقے اپنی اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ پارٹی کے کارکن اس موقف کے حامی ہیں کہ پاکستان کو کسی بھی ملک کا دست نگر نہیں بننا چاہیئے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس وقت بھی یہ ملک جتنا مقروض ہے، وہی قرضے ادا کرنے کے لیے ہماری نسلیں گروی رکھی ہوئی ہیں، مزید قرضے لے کر ہم کیسے ادا کر سکیں گے۔ اس لیے امریکہ کی طرف نظر اٹھانا بھی

عوامی جمہوریہ چین ہمیں خود کفیل دیکھنا چاہتا ہے

ہمارے لیے مہلک ہے۔ امریکہ نہ صرف ہمیں اور زیادہ قرضوں میں جکڑ دے گا بلکہ ہماری پالیسیوں کا بھی رُخ موڑنے پر مجبور کر دے گا۔

امریکہ ویت نام سے اپنی فوجیں نکالنے کے بعد اپنے اسلحہ اور فوجیوں کے لیے منڈی ضرور تلاش کرے گا اس لیے اسے پاکستان سے بہتر علاقہ کونسا ملے گا؟ بھارت روس سے بیس سالہ معاہدے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اس لیے اس کا روس کے حلقۂ اثر سے نکلنا بہت مشکل ہوگا۔ روس اور امریکہ کے باہمی تصادم اور اپنے اپنے اسلحہ کے استعمال کے لیے اس سے بہتر میدان نہ مل سکے گا۔ اس لیے اب امریکہ بھی اگر پاکستان پر فراخدلی سے نظرِ کرم کرے تو اس سے خبردار رہنا چاہیئے۔ ہم اگر جنگ لڑیں گے تو اپنی جنگ لڑیں گے اور آپ لڑیں گے۔ ہم اپنے کندھے دوسروں کی بندوقوں کے لیے استعمال نہ ہونے دیں گے۔

چین واضح طور پر چاہتا ہے کہ ہماری پالیسیوں کا رُخ صحیح سمت میں ہو، اور ہم کسی کے دست نگر یا غلام نہ بننے پائیں۔ اس لیے ہمارے صحیح فیصلوں کی وہ تعریف کرتا ہے اور بروقت ہمیں مدد بھی دیتا ہے۔ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ جتنی چاہے امداد لے لو بلکہ یہ کہتا ہے کہ ہم خود کو خود کفیل بنانے میں مدد کر سکتے ہیں۔

قرضہ سُود کے بغیر دیتا ہے اور ہماری خارجہ پالیسی کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لیے کبھی زور نہیں دیتا۔ چین کی طرف سے پاکستان کی واضح حمایت سے اور صدر نکسن کی کامیابی کے باعث بھارت کو یہ تشویش ہوگئی ہے کہ پاکستان کو ان دونوں بڑی طاقتوں کی شہ حاصل ہے۔ اس لیے اندرا گاندھی نے پھر جنگ کے نعرے بلند کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ حالانکہ ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ صرف امریکہ کو بلیک میل کرنے کی کوشش ہے۔ امریکہ بھی اس وقت چاہتا ہے کہ بھارت جتنی بڑی منڈی بالکل روس کے لیے وقف ہو کر نہ رہ جائے۔ اس کی بڑی کوشش ہے کہ بھارت اس سے آملے۔ اس لیے پاکستان پر وہ زیادہ توجہ دے گا تاکہ بھارت چڑھے، اس طرح بھارت کو رام کرنے کا موقع مل سکے۔ اس طرح امریکہ اور روس دونوں کی حیثیت ایک، ہی بنتی ہے کہ وہ بھارت کو استعمال کر کے پاکستان کو دبانا چاہتے ہیں۔

ایسے حالات میں روس یا امریکہ کسی سے بھی زیادہ توقعات وابستہ کرنا خطرناک ہے۔ حقائق کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہماری بقا صرف اور صرف اپنی زمین میں چھپے خزانوں اور اپنے دست و بازو استعمال کرنے میں مضمر ہے ——— اس کے لیے اپنے عوام پر زیادہ سے زیادہ بھروسے کی ضرورت ہے۔

اس وقت حکومت پر سرمایہ داروں اور غیر ملکی ایجنٹوں نے جو دباؤ ڈال رکھا ہے اس کی وجہ سے ہر طرف یہ خطرہ ہے کہ اب امریکی امداد کی بھیک مانگی جائے گی۔ بہت سے سرکاری دفاتر میں اس سلسلے میں کاغذی کارروائیاں شروع ہوگئی ہیں۔ انہی حلقوں کی طرف سے اس قسم کی فضا پیدا کی گئی تھی کہ پاکستان کی بقا اسی میں ہے کہ صدر نکسن کامیاب ہو جائیں ——— جیسے صدر نکسن

اندرا گاندھی جنگ کا نعرہ بلند کر کے امریکہ کو بلیک میل کرنا چاہتی ہیں

کی کامیابی کے بعد امریکہ پاکستان کے تمام دُکھ اور الجھنیں دُور کر دے گا ——— کیا صدر نکسن گزشتہ چار سال سے امریکہ کے صدر نہیں ہیں؟ اور کیا اس عرصہ میں ہی پاکستان پر تاریخ کی سب سے بڑی آفتیں نہیں ٹوٹیں؟ پاکستان کے دو ٹکڑے ہوئے، بھارت نے پاکستان کو تباہ و برباد کیا۔ گزشتہ ایک برس سے ہمارے نوّے ہزار سے زائد فوجی اور شہری بھارت کی قید میں ہیں، امریکہ نے بھارت پر کونسا زور ڈالا اور کونسی طاقت استعمال کی؟

اب بھی ہمارے دوست وہ ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر اور اصولوں کی بنیاد پر اب تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا۔ اس میں افریقہ اور ایشیا کی برادری سے اکثریت ایسی ہے اسی طرح عظیم دوست عوامی جمہوریہ چین نے اب تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا ہے ——— دوست ایسے ہوتے ہیں۔ امریکہ جیسے دوست نہیں، جو پاک بھارت جنگ ۱۹۷۱ء کے دوران اس کے لئے کوشاں رہا کہ بھارت پر یہ تاثر کسی طرح نہ ہو کہ امریکہ کی پالیسیوں کا جھکاؤ پاکستان کی طرف تو نہیں۔

بعض حلقوں کی طرف سے یہ تاثر بھی دیا جا رہا ہے کہ اس وقت چین اور امریکہ کی پالیسیاں ایک ہیں اور دونوں مل کر روس کے خلاف محاذ قائم کریں گے اس لئے ہمیں امریکہ کی روش ضرور اختیار کرنی چاہیئے۔ یہ بالکل غلط سوچ ہے۔ ایسی سوچ کو کسی طرح حمایت حاصل نہیں ہونی چاہیئے

پیپلز پارٹی کا کنونشن اس مہینے کے آخر میں ہو رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں سے عوام کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس کنونشن کی تیاری کے لیے جو ابتدائی کنونشن اور اجلاس ہو رہے ہیں۔ ان میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے اپنی ہائی کمان اور وزراء کو کھری کھری سنائی ہیں، اس لئے یہ ہائی کمان اور وزراء ابھی سے خبردار تو ہو گئے ہیں۔ ان کارکنوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ پیپلز پارٹی نے عوام سے جو وعدے کئے تھے، انھیں بہرحال پورا کرنا ہے۔ ہم کسی طرح عوام سے غداری نہیں کر سکتے۔ اور خاص طور پر کسی سامراجی بلاک کے سامنے سر نہیں جھکا سکتے۔ امریکہ سے گہرے تعلقات کی صورت قبول نہیں ہے، اور نہ روس جیسے نئے سامراج کے ہم غلام بن سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرنا ہے۔

وزیروں اور رہنماؤں کا یہ خیال ہے کہ اس کنونشن میں اگر بعض قراردادیں واضح طور پر منظور نہ کی جا سکیں، اور انھیں کارکنوں کی پوری حمایت حاصل نہ ہو، تو اس کنونشن سے یہ منظوری لے لی جائے، کہ صدر کو ہر معاملے میں پورے اختیارات حاصل ہوں گے۔ اور وہ جس قسم کا فیصلہ کریں، کارکنوں کو منظور ہوگا۔

لیکن اب کے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کا یہ خیال ہے کہ صدر بھٹو کو یہ مطلق العنان اختیاری نہ دی جائے، کیونکہ بہت سے مسائل پر وہ اپنے جن قریبی ساتھیوں سے مشورہ کرتے ہیں، وہ سب امریکہ کے زیرِ اثر ہیں۔ اس لئے وہ اس طرز کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ کچھ مرکزی وزیر اور کچھ خصوصی معاونین کی لائن بھی ہے۔ اس لئے کارکنوں نے یہ عزم ظاہر کیا ہے کہ جو بنیادی اہمیت کے مسائل ہیں، ان پر صدر بھٹو کو مکمل اختیارات نہ دیئے جائیں بلکہ ان پر واضح پالیسی اختیار کی جائے اور دوٹوک فیصلہ کیا جائے۔

اب دیکھیں پیپلز پارٹی کے کنونشن میں کیا ہوتا ہے؟



ویتنام
منزل بہ منزل



: وہاب صدیقی :

• ۲۲ دسمبر ۱۹۴۴ء کو ہوچی منہہ کی قیادت میں "ویت نام لبریشن پراپیگنڈہ یونٹ" قائم کیا گیا۔ اس میں ۳۴ حریت پسند شامل تھے۔ ان کے پاس ۳۱ بندوقیں، دو مشین گنیں اور سو کارتوس تھے۔ بعد میں یہ ویت نام کی عوامی فوج کا ہراول دستہ ثابت ہوا۔

• ۲ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ہوچی منہہ نے ویت نام کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

• مارچ ۱۹۴۶ء میں فرانس نے ویت نام کی محدود آزادی کو ہوچی منہہ کی قیادت میں تسلیم کر لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پانچ سال تک ویت نام میں اپنے فوجی دستے رکھنے کا حق بھی حاصل کر لیا۔

• جون ۱۹۴۶ء میں فرانس کے مقامی حکام نے جنوبی ویت نام کی "عارضی حکومت" کے قیام کا اعلان کر دیا۔

• دسمبر ۱۹۴۶ء سے مارچ ۱۹۴۷ء کے دوران فرانس ویت نام کے ساحلی علاقوں پر اپنا تسلّط قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا، جب کہ دیہاتوں پر حریت پسندوں نے قبضہ کر لیا۔

• اکتوبر ۱۹۴۹ء میں، چین میں کمیونسٹ پارٹی برسرِ اقتدار آئی۔ چیئرمین ماؤزے تنگ نے، ہوچی منہہ کی مکمل اور بھرپور حمایت کا اعلان کیا۔

• جون ۱۹۵۰ء میں کوریا میں جنگ کا آغاز ہوا۔ امریکی سامراج نے ویت نام میں فرانسیسی نوآبادکاروں کو امداد دینی شروع کی، یہ امداد پچاس کروڑ امریکی ڈالر سالانہ تھی۔

• جولائی ۱۹۵۳ء میں کوریا میں جنگ بند ہو گئی۔ شمالی ویت نام میں گوریلا جنگ اور تیز ہو گئی۔ فرانس نے "ڈین بن پھو" کی چوکی پر قبضہ کر لیا۔

• مارچ ۱۹۵۴ء میں ویت منہہ نے "ڈین بن پھو" کا علاقہ خالی کر دیا۔ یہ پسپائی گوریلا جنگ کی حکمتِ عملی کے تحت اختیار کی گئی تھی۔

• ۸ مئی ۱۹۵۴ء کو ویت منہہ نے "ڈین بن پھو" کا تاریخی معرکہ سَر کر لیا۔ اس لڑائی نے فرانسیسی نوآبادکاروں کی کمر توڑ دی اور وہ جنوب مشرقی ایشیا سے اپنا بوریا بستر گول کرنے پر مجبور ہو گئے۔

• ۲۱ جولائی ۱۹۵۴ء کو جنیوا معاہدہ ہوا جس کے تحت فرانس نے اقتدارِ اعلیٰ لاؤس کمبوڈیا، شمالی ویت نام اور جنوبی ویت نام کو منتقل کر دیا اور یہ طے پایا کہ ویت نام کو متحد کرنے کے لیے دو سال کے بعد انتخابات کرائے جائیں گے۔ ہوچی منہہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ہنوئی گئے، اور اسے شمالی ویت نام کا دارالحکومت بنایا گیا۔ جنوبی ویت نام میں امریکی سامراج کی حمایت سے جنرل ڈائم نے حکومت بنائی۔

• ستمبر ۱۹۵۴ء میں امریکی سامراج نے "سیٹو" کی تنظیم کھڑی کی تاکہ ہند چینی میں اپنے مفادات کا تحفظ کر سکے۔

• فروری ۱۹۵۵ء میں جنرل ڈائم اور جنوبی ویت نام کے دیگر سیاسی عناصر کے اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ امریکہ نے جنرل ڈائم کی حمایت کی اور جنوبی ویت نام کی فوج کو تربیت دینی شروع کر دی۔ امریکی فوجی مشیروں کی تعداد ۳۴۲ کر دی گئی

• ۱۶ جولائی ۱۹۵۵ء کو جنرل ڈائم نے انتخابات کروانے سے واضح طور پر انکار کر دیا۔ ان انتخابات میں ویت نام کو متحد کرنے کے لیے عوام سے رائے لینی تھی۔ امریکی سامراج نے جنرل ڈائم کی حمایت کی، بعد میں امریکی صدر آئزن ہاور نے کہا کہ ان انتخابات میں ہوچی منہہ کی کامیابی یقینی تھی۔

• ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۹ء کے دوران ویت منہہ نے گوریلا جنگ دوبارہ شروع کر دی۔ اور جنرل ڈائم کے حامی سینکڑوں مقامی حکام کو قتل کر دیا۔

• مئی ۱۹۶۰ء میں امریکی فوجی مشیروں کی تعداد بڑھا کر ۶۸۵ کر دی گئی۔ یہ زیادہ سے زیادہ تعداد تھی جو جنیوا معاہدے کے تحت مقرر کی گئی تھی۔

• دسمبر ۱۹۶۰ء میں امریکی سامراج نے جنیوا معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فوجی مشیروں کی تعداد ۹۰۰ کر دی۔ اس پر کمیونسٹوں نے "قومی محاذِ آزادی جنوبی ویت نام" قائم کیا اور اس کے جنگی بازو کو "ویت کانگ" کا نام دیا گیا۔

• اکتوبر ۱۹۶۱ء میں صدر کینیڈی نے جنرل میکسول ٹیلر کو مشیرِ خصوصی کی حیثیت سے جنوبی ویت نام بھیجا۔ ٹیلر نے صدر آئزن ہاور کے زمانے میں بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا تھا۔ کیونکہ اس نے ویت نام میں ایٹمی جنگ شروع کرنے پر زور دیا تھا۔ جنرل ٹیلر نے مشیرِ خصوصی بنتے ہی جنوبی ویت نام میں امریکی فوج کی تعداد میں اضافہ کرنے کا مشورہ دیا چنانچہ تعداد بڑھا کر تین ہزار دو سو کر دی گئی۔

• مئی ۱۹۶۳ء میں بدھ مت کے پیروکاروں اور طلباء نے جنرل ڈائم کی

حکومت کے خلاف زبردست مظاہرے کیے۔ بدھ مت کے عالم تھیچ کوانگ دوک نے احتجاجاً خود کو آگ لگا کر خودکشی کر لی۔ پورے سائیگاؤں میں ہنگامے زور پکڑتے گئے۔ امریکی اخبارات نے بھی جنرل ڈائم پر کڑی نکتہ چینی کی۔

• یکم نومبر ۱۹۶۳ء کو جنوبی ویت نام کے چند فوجی افسروں نے امریکہ کے اشارے پر جنرل ڈائم کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اسے قتل کر دیا۔ جنرل ڈانگ وان منگ برسرِ اقتدار آیا لیکن ابھی وہ حکومت مستحکم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اسے بھی اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ ۱۹ ماہ میں تیرہ حکومتیں تبدیل ہوئیں۔ ویت کانگ دیہاتوں میں مؤثر طاقت بن گئے۔

• ۲ راگست ۱۹۶۴ء کو امریکی سامراج نے اپنے دو تباہ کن جہاز خلیج ٹونکن میں بھیج دیئے۔

• ۵ راگست ۱۹۶۴ء کو صدر جانسن نے ہند چینی کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے کانگرس پر زور دیا کہ وہ ایسی قرارداد پاس کرے جس سے انہیں "تمام ضروری اقدامات" کرنے کے اختیارات مل جائیں۔ سینٹ نے اس قرارداد کو دو کے مقابلے میں ۸۸ اور ایوانِ زیریں نے ۴۱۶ ووٹوں کی اکثریت سے منظور کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء کے اواخر تک جنوبی ویت نام میں امریکی فوج کی تعداد ۲۳ ہزار کر دی گئی۔

• ۳ رنومبر ۱۹۶۴ء کو صدر جانسن نے اپنی انتخابی مہم کے دوران "جنگ نہ پھیلانے" کا وعدہ کیا۔

• ۷ رفروری ۱۹۶۵ء کو ویت کانگ نے ایک امریکی اڈے پر حملہ کر کے آٹھ امریکیوں کو قتل کر دیا۔ صدر جانسن نے شمالی ویت نام پر فضائی حملے کا حکم دے دیا۔

• ۶ رمارچ ۱۹۶۵ء کو "محدود تحفظ کے لیے" امریکی سامراج نے پہلی دو میرین بٹالین جنوبی ویت نام بھیج دیں۔

• اپریل ۱۹۶۵ء میں صدر جانسن نے مکاری سے کام لیتے ہوئے کہا کہ امریکہ امن کے لیے گفت و شنید کرنے کو تیار ہے اور وہ جنوبی ویت نام کو آزاد چھوڑ دے گا لیکن ہنوئی نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ تمام امریکی فوجوں کو واپس بلایا جائے اور ویت نام کے دو حصوں کو متحد کیا جائے۔

• جون ۱۹۶۵ء میں جنوبی ویت نام کی فوج نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کا تختہ الٹ دیا۔ جنرل تھیو صدر اور ایئر وائس مارشل کاؤ کی وزیراعظم بن گئے۔

• اکتوبر ۱۹۶۵ء میں جنوبی ویت نام میں امریکی فوج کی تعداد ایک لاکھ ۴۸ ہزار کر دی گئی۔ امریکی کمانڈر جنرل ولیم ویسٹ مورلینڈ نے جنگ جیتنے کے لیے اپنی حکومت سے مزید ساڑھے تین لاکھ فوج کی کمک مانگی۔

• ۱۵، ۱۶ راکتوبر ۱۹۶۵ء میں امریکی عوام نے ویت نام میں امریکی جارحیت کے خلاف مظاہرے کیے۔

• ۲۴ دسمبر ۱۹۶۵ء کو جانسن نے بمباری بند کرنے کا حکم دیا اور امن کی تجاویز پر مشورہ کرنے کے لیے دنیا کے مختلف ممالک میں اپنے نمائندے بھیجے لیکن یہ مشن ناکام رہا اور ۳۷ دن کے بعد دوبارہ بمباری شروع کر دی گئی۔

• اپریل ۱۹۶۶ء میں شمالی ویت نام پر بمباری کے لیے امریکی سامراج نے "بی/۵۲ ایس" طیارے استعمال کیے اور اس سال کے آخر تک جنوبی ویت نام میں امریکی فوج کی تعداد تین لاکھ ۹۰ ہزار کر دی گئی۔

• مئی ۱۹۶۷ء میں امریکی فوج کی تعداد چار لاکھ ۶۳ ہزار کر دی گئی۔

• ستمبر ۱۹۶۷ء میں امریکہ نے جنوبی ویت نام میں "جنوبی ویت نام کی حقِ خود اختیاری" کے لیے انتخابات کا ڈھونگ رچایا۔ عوام کی اکثریت نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ جنرل تھیو کی کامیابی کا اعلان کر دیا گیا۔

• ۱۷ رجنوری ۱۹۶۸ء کو صدر جانسن نے اس شرط پر بمباری بند کرنے کی خواہش کا اظہار کیا کہ بمباری بند ہونے سے نتیجہ خیز گفت و شنید کے امکانات پیدا ہوں۔

• ۲۲ رجنوری ۱۹۶۸ء کو ویت کانگ نے کھیسان کے اڈے پر زبردست حملہ کیا

• ۳۰ رجنوری ۱۹۶۸ء کو ویت کانگ نے تمام بڑے شہروں پر بھرپور حملے کیے۔ ویت کانگ کے ایک کفن بردار دستے نے سائیگاؤں میں امریکی سفارت خانے پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اور یہ قبضہ مرتے دم تک برقرار رکھا۔

• ۳۱ رمارچ ۱۹۶۸ء کو صدر جانسن نے دوبارہ صدارتی انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کیا اور امن کی بات چیت کی پیش کش کی۔

• ۱۳ رمئی ۱۹۶۸ء میں امریکہ شمالی ویت نام اور ویت کانگ کے درمیان امن کے مذاکرات پیرس میں شروع ہوئے۔

• ۸ رجون ۱۹۶۹ء کو صدر نکسن نے جنرل تھیو سے ملاقات کے بعد اعلان کیا کہ جنوبی ویت نام میں مقیم امریکی فوج کی تعداد، جو ۵ لاکھ ۴۱ ہزار ہے، ستمبر تک صرف ۲۵ ہزار کر دی جائے گی۔

• ۴ راگست ۱۹۶۹ء کو پیرس میں ہنری کیسنگر اور شمالی ویت نام کے نمائندوں کے درمیان پہلی خفیہ ملاقات ہوئی۔

• ۳ رستمبر ۱۹۶۹ء کو صدر ہوچی منہ کا انتقال ہو گیا

• ۱۵ رنومبر ۱۹۶۹ء کو امریکہ میں ویت نام کی جنگ کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے!

• ۳۰ راپریل ۱۹۷۰ء کو صدر نکسن نے کمبوڈیا پر حملہ کرنے کا حکم دیا اور پرنس سہانوک کو برطرف کر کے اپنی پٹھو حکومت قائم کر دی۔

• ۲۹ رجون ۱۹۷۰ء کو کمبوڈیا سے امریکی فوج کا آخری دستہ بھی واپس آ گیا۔

• ۷ راکتوبر ۱۹۷۰ء کو نکسن نے "جہاں ہیں، جیسے ہیں" کی بنیاد پر ہند چینی میں جنگ بند کرنے کی تجویز پیش کی۔ لیکن شمالی ویت نام نے اسے مسترد کرتے ہوئے امریکی فوجوں کی غیر مشروط واپسی کا مطالبہ کیا۔

• فروری، مارچ ۱۹۷۱ء میں امریکی فوج لاؤس میں داخل ہو گئی۔

• ۹-۱۱ رجولائی ۱۹۷۱ء کو ہنری کیسنگر نے عوامی جمہوریہ چین کا خفیہ دورہ کیا۔

• ۲۱-۲۸ رفروری ۱۹۷۲ء کو صدر نکسن نے نئے عوامی جمہوریہ چین کا دورہ کیا اور تائیوان کو عوامی جمہوریہ چین کا اٹوٹ حصہ تسلیم کر لیا۔

• ۳۰ رمارچ ۱۹۷۲ء کو شمالی ویت نام اور ویت کانگ نے جنوبی ویت نام کے مختلف علاقوں پر بھرپور حملے کیے۔

• یکم مئی ۱۹۷۲ء کو ویت کانگ اور حریت پسندوں نے کوانگ تری پر قبضہ کر لیا

• ۸ رمئی ۱۹۷۲ء کو صدر نکسن نے شمالی ویت نام کی بحری ناکہ بندی کرنے کا حکم دیا پھر اعلان کیا کہ آئندہ چار ماہ تک تمام امریکی فوج واپس بلا لی جائے گی۔

• ۱۷ رجون ۱۹۷۲ء کو جنوبی ویت نام میں امریکی فوج کی کل تعداد ساٹھ ہزار رہ گئی۔

• ۸ راکتوبر ۱۹۷۲ء ہنری کیسنگر نے شمالی ویت نام سے خفیہ مذاکرات کیے۔ اور عارضی طور پر جنگ بندی ہو گئی۔

سرورق کی کہانی

آغا مسعود حسین

شمالی ویت نام اور شمالی کوریا سے
پاکستان کی دوستی کا نیا باب

حکومتِ پاکستان نے عوامی جمہوریہ ویت نام اور عوامی جمہوریہ شمالی کوریا کو سرکاری سطح پر تسلیم کر کے خارجہ پالیسی میں مثبت رجحانات کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ ایک ایسی تبدیلی ہے جس پر عوام کو بجا طور پر خوش ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ اب پاکستان حقیقی طور پر افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ میں ترقی پسند ممالک کے قریب آگیا ہے۔ جو ایک عرصۂ دراز سے سامراج اور نوسامراج کے خلاف آزادی اور بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں یہ اہم تبدیلی پاکستان کے عوام کی امنگوں کی آئینہ دار ہے جو گذشتہ پچیس برس سے ایشیائی عوام کے ساتھ ہر طور پر ان کی جدوجہد آزادی میں شریک ہیں اور جنھوں نے بنڈونگ کانفرنس میں دس نکات پر دستخط کر کے سامراج کے خلاف، قوموں کی آزادی کے حق میں اور دنیا بھر کے محکوم عوام کے حق میں اپنی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ اور جنوب مشرقی ایشیا کے ان دو عظیم ملکوں کو تسلیم کر کے پاکستان نے انتہائی حقیقتوں کو تسلیم کر لیا ہے، جہاں سے اب نئے دور کی قیادت ابھر چکی ہے۔

اس کے ساتھ ہی حکومت نے معاہدہ جنوب مشرقی ایشیا سے بھی علیحدگی کا اعلان کر کے اس بدنام زمانہ معاہدے کو اپنے ملک کی حد تک کیفرِ کردار کو پہنچا دیا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے، کیوں کہ ماضی میں پاکستان کے عوام سیٹو اور سینٹو سے علیحدگی کے لیے حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے ــــ اس سلسلہ میں پاکستان کے طلبہ مبارک باد کے مستحق ہیں جنھوں نے ان معاہدوں کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ہی سے ان کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی، کیونکہ ان دو معاہدوں نے پاکستان کے عوام کو اپنے ایشیائی بھائیوں سے کاٹ دیا تھا۔ اور پاکستان ایشیائی عوام کی تحریکاتِ آزادی کے خلاف، سامراجی ممالک کا حلیف بن کر ایشیا کے سیاسی اُفق پر اُبھرا تھا ــــ ماضی میں ہندوستان سمیت چند ممالک نے پاکستان کو ان معاہدوں کے خلاف زیادہ بدنام اور سیاسی طور پر ایشیائی عوام سے کاٹ دینے کی پالیسی پر عمل کیا۔ ان میں روس بھی شامل تھا جس نے پاکستان کو اسی قسم کے سامراجی بندھن میں پھانسنے کی کوشش کی تھی ــــ لیکن حکومت کے ان عمل کو، جس میں معاہدہ جنوب مشرقی ایشیا سے علیحدگی بھی شامل ہے، تجزیہ کرنے کی اس لئے ضرورت پیش آرہی ہے کیوں کہ بہرحال پاکستانی عوام کے سامنے ان نئی حقیقتوں کی نشاندہی کرونی چاہیئے جو ہمارے ملک کی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کا باعث بنے ہیں۔

دراصل پاکستان نے شمالی ویت نام اور شمالی کوریا کو سرکاری سطح پر اس لئے تسلیم کیا ہے کہ اب جنوب مشرقی ایشیا میں طاقت صحیح لوگوں کے پاس آرہی ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں سب سے گہری تبدیلی ویت نام کی جنگ سے آئی ہے۔ اس جنگ نے دنیا کے تمام ملکوں پر اپنے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ ویت نام کے عوام گذشتہ ۳۵ سال سے جاپان، فرانسیسی اور امریکی سامراج کے خلاف اپنی آزادی اور حق کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ویت نام میں سب سے پہلے جاپانی حملہ آور ہوئے اور انھوں نے اس سرزمین کی ساری کاشت پر اپنی اجارہ داری قائم کرلی۔ آج سے بیس سال پہلے ویت نام ایشیا میں چاول کی کاشت اور پیداوار کے لئے دنیا بھر میں مشہور تھا۔ جاپانی حملہ آور اس خطہ میں زیادہ عرصہ اپنے قدم نہیں جما سکے اور ویت نامیوں کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن سامراجی تاریخ ہٹتے ہٹتے بھی اپنے اثرات قائم کر کے رخصت ہوئی۔ فرانسیسی تاجر جاپان کے خلاف ویت نامیوں کے سامنے آئے انھوں نے جاپانیوں کے جاتے ہی اپنا اقتدار جما لیا۔ ایک بار ویت نامیوں نے دوبارہ فرانسیسیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ اور وہ ــــ دس سال تک فرانسیسیوں کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ تاآنکہ جنیوا معاہدہ کے ساتھ فرانسیسیوں کے بدلے امریکی سامراج اپنی ہیبت ناک قوت کے ساتھ ابھرا ڈیم خاندان نے جو کہ قوم پرست واقع ہوا تھا، امریکہ کے ساتھ ساز باز کر کے ۱۹۴۰ء کے معاہدہ جینوا کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ۱۷ ویں خطِ متوازی کو دونوں ویت نام کے درمیان دائمی حیثیت دی جسے ویت نام کے عوام نے مسترد کر کے دوبارہ جنگ شروع کر دی۔ اس طرح ۳۵ سال میں ویت نامیوں کو صرف پانچ مہینہ امن کے ملے، ورنہ سارا عرصہ وہ آزادی کی بقا کے لئے لڑتے رہے۔

ویت نام کے عوام کی جدوجہد آزادی کے دوران پھر امریکہ نے امن مذاکرات کا ڈھونگ رچا کر بین الاقوامی دنیا کی اصل واقعے سے توجہ ہٹانے کی ناکام کوشش کی، لیکن مسلسل شکست، کے سامنے امریکہ کو بنیادی حقائق تسلیم کرنا پڑا مثلاً ــــ امریکہ کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ، ۱۷ واں خطِ متوازی اب عارضی حد بندی ہے اور امریکہ کو جنیوا معاہدہ کو تسلیم کرتے ہوئے پورے ویت نام میں حق خودارادی معلوم کرنا ہوگا۔ ویت کانگ چند باغی نوجوانوں کی ٹولی نہیں ہے، بلکہ انھیں جنوبی ویت نام کے عوام کی حمایت حاصل ہے • شمالی ویت نام جنوبی ویت نام کے عوام کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا • مزید جنگ جاری رکھنے میں امریکہ کی اقتصادی بربادی اور امریکی عوام کا مسلسل خون خرابہ ہے • چین کے ساتھ تعلقات میں استحکام اس میں وقت پیدا ہو سکتا ہے، جب امریکہ شمالی ویت نام پر بمباری بند کرے اور معاہدہ جینوا کے اصولوں کی پابندی کرے۔

یہ وہ حقائق ہیں جو شمالی ویت نام اور جنوبی ویت نام کے حریت پسند انسانوں نے امریکہ جیسی طاقت کے خلاف مسلسل جنگ کر کے ساری دنیا سے تسلیم کروا لئے ہیں اور اب امریکی انتخابات کے ساتھ ہی شمالی ویتنام پر بمباری اور سارے ویت نام کا مسئلہ بہت جلد حل ہو جائے گا۔ امریکہ کو اس حقیقت کا بھی علم ہو چکا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی چمک جنوب مشرقی ایشیا میں پھیلی ہوئی غربت کو نہیں چھپا سکتی۔ اور اس غربت کو صرف عوامی جدوجہد اور اجتماعی قیادت ہی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ شمالی کوریا کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں اس دو کروڑ کے ملک نے کم ال سنگ کی قیادت میں ایک ایسا سماج تعمیر کیا ہے جہاں ہر قسم کا استحصال حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا ہے ــــ ویت نام کی عظیم جدوجہد نے ہی امریکہ کو یہ بھی باور کرا دیا کہ اشتراکیت کو روکنے والے تمام منہ توڑ دیئے جائیں گے اور معاہدہ جنوب مشرقی ایشیا خود اس کے خالق کی نظروں سے گر گیا ــــ امریکی وزارت خارجہ کو ویت نام میں نئی تبدیلیوں کے پیش نظر یہ احساس ہو گیا تھا کہ سیٹو کی اب کوئی وقعت نہیں۔ کیونکہ عوام نے اپنا

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں

سندھ کی ہاری تحریک

- مائی بختاور اور بالاچ بروہی کس طرح شہید ہوئے
- ہاریوں کو ان کے حقوق خیرات میں نہیں ملیں گے
- زمینداروں کے خوف سے ہمارے رشتہ دار تک ہم سے بیزار رہتے تھے۔



رئیس بروہی اپنے چھوٹے بیٹے ادریس بروہی کے ساتھ

بید خلیاں

پہلے سے بھی وسیع پیمانے پر ہو رہی ہیں

احفاظ الرحمٰن

جب ہم سیرہاری سے سات میل پیدل چل کر میرآچن گوٹھ پہنچے تو سارا گاؤں سو چکا تھا۔ ہم رئیس بروہی کے مکان کے آگے کھڑے ہوئے تھے۔ شبر اعظمی اور خالق بروہی انہیں آواز دے رہے تھے اور گاؤں کے تمام کتے ہمیں گھیرے کھڑے تھے۔

کچھ دیر بعد رئیس بروہی باہر نکلے۔ وہ شبر اعظمی کو پہلے سے جانتے تھے انہوں نے اسے بڑی گرم جوشی سے گلے لگایا اور جب شبرؔ نے میرا تعارف کرایا تو انہوں نے سندھیوں کے روایاتی انداز میں مجھ سے بھی معانقہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم اُن کے مہمان خانے "حجرے" میں بیٹھے ہوئے تھے۔

رئیس بروہی کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ سندھ کے مشہور ہاری رہنما ہیں۔ اور گزشتہ ۷ سال سے کسانوں کے حقوق کے لئے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ چھوٹا ساقد، خشخشی داڑھی، سر پر سیاہ ٹوپی، سفید شلوار اور سفید قمیص میں ملبوس رئیس بروہی میرے سامنے چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے اور میں ان کے چہرے کی جھریوں میں سالہا سال کی پرخلوص جدوجہد کا عکس دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے میں بارہا ان کا نام سن چکا تھا اور آج پہلی بار کسانوں کے اس عظیم فرزند کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جس نے جاگیردارانہ فضا میں بڑی بڑی طاقتوں سے ٹکر لی تھی۔

ہم چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے بڑی دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ رئیس بروہی ہم سے کراچی کے مزدوروں کی ہڑتال کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ اور بار بار یہ کہتے رہے کہ کسانوں میں خاطر خواہ کام نہیں ہو رہا ہے۔

رات کافی جا چکی تھی، ہم نے انہیں کچی نیند سے جگایا تھا۔ اس کے باوجود وہ بڑی شگفتگی کے ساتھ ہم سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی چمک یہ بتا رہی تھی کہ انھیں اس اچانک ملاقات پر بے اندازہ خوشی ہوئی ہے۔

"واہ صاحب، واہ!" وہ اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لئے بار بار یہ جملہ دہراتے رہے۔ جب ہم یہ جملہ سنتے تو ہمارے دلوں میں یہ احساس اور شدید ہو جاتا کہ کراچی سے خیبر تک انسان کی آزادی کے گیت گانے والے تمام فاصلوں اور تمام دیواروں کو توڑ کر ایک آواز میں ڈھل گئے ہیں ——— "یہ دنیا ان محنت کشوں کی ہے جو اس دھرتی کی حرمت کی حفاظت کرتے ہیں اور بدی کی تمام قوتوں کے آگے سینہ سپر ہوتے ہیں۔ یہ دنیا ان مزدوروں کی ہے جو مشینوں کی دھن پر زندگی کا نغمہ ڈھالتے ہیں۔ یہ دنیا اُن کسانوں کے لئے ہے، جن کے ہاتھ مٹی کی خوشبو سے مہکتے ہیں۔ ہم جہاں کہیں ہیں ایک دوسرے کی آواز پر آواز دیتے ہیں۔ کراچی کے مزدور پر گولی چلتی ہے تو میرآچن کا کسان تڑپ اٹھتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں جیت ہماری ہوگی!"

رئیس بروہی بڑی دلچسپی سے دیر تک مجھ سے چین کی زندگی کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور صبح ہمیں شہداد پور کے لئے روانہ ہونا تھا۔ شبر اعظمی نے ان سے کہا "سائیں! ہم الفتح کا حسن ناصر نمبر نکال رہے ہیں۔ آپ حسن ناصر کو قریب سے دیکھ چکے ہیں، ہم آپ کے تاثرات جاننا چاہتے ہیں۔"

"سُرخ جھنڈے والوں"
کی آمد کی خبر سُن کر
زمیندار اور پولیس والے
بھاگ گئے



شبّر اعظمی، رئیس بروہی، خالق بروہی، ادریس بروہی گاؤں کے بچّوں کے ساتھ

رئیس بروہی کا چہرہ ایک دم تمتما اٹھا اور پھر وہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں ہمیں یہ بتانے لگے کہ سندھ کی ہاری تحریک میں حسن ناصر نے کتنی سرگرمی کے ساتھ ایک نمایاں کردار ادا کیا تھا الفتح کے پچھلے شمارے میں، میں حسن ناصر کے بارے میں ان کے تاثرات تحریر کر چکا ہوں۔ یہاں میں ان کے الفاظ میں سندھ کی مشہور بٹائی تحریک کا ذکر کروں گا جس نے یہاں کے ہاریوں میں بیداری اور زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔

"میں ۱۹۴۵ء میں ہاری تحریک میں شریک ہوا تھا۔ اس وقت ہاریوں کی حالت جانوروں سے بھی بدتر تھی انہیں زمیندار کے آگے چوں تک کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ وہ سال بھر اس کے کھیتوں میں ہل چلاتے تھے اور ان کے بچے سال بھر بھوک سے بلکتے رہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں بٹائی تحریک شروع ہوئی۔ مرحوم میاں محمد، مرحوم خداداد، مبارک تالپور اور میں نے اپنے علاقے میں ہاریوں کے اس حق کے لئے جدوجہد شروع کر دی کہ وہ سال بھر کی محنت کے بعد جو کچھ اگاتے ہیں، اس کا نصف حصہ ان کو ملنا چاہیئے۔ پولیس کا ایک داروغہ بھی نوکری چھوڑ کر ہماری جدوجہد میں شامل ہو گیا۔ اس وقت تک تحریک برائے نام تھی۔ ڈاکٹر آشارام نے جو ایک دردمند دل رکھتے تھے اور کسانوں کی حالت دیکھ کر کڑھتے رہتے تھے شہداد پور میں ہم سے ملاقات کی اور ہمیں ہاری کمیٹی کا رکن بنایا۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس جگہ زمیندار نسبتاً کمزور اور ہاری تحریک نسبتاً مضبوط ہے، وہاں سے پورے زور شور کے ساتھ بٹائی تحریک کا آغاز کیا جائے اور زمینداروں کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ فصل کا نصف حصہ ہاریوں کے حوالے کر دیں۔

سب سے پہلے ہم نے میرآچن کے گرد پانچ میل کے علاقہ میں ہاریوں کو منظم کرنا شروع کیا۔ اس کا فیصلہ ۱۹۴۶ء میں کل سندھ ہاری کنونشن منعقدہ سرہاری میں کیا گیا تھا کہ کسانوں کے اس حق کے لیے منظم انداز میں جدوجہد کی جائے اس وقت ہاری کمیٹی کے صدر مرحوم عبدالقادر تھے۔ ہم نے دوسرے ساتھیوں کو دعوت دی کہ وہ ہمارے ساتھ کام کرنا چاہیں تو ہم میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ مولوی عزیز اللہ غلام محمد لغاری، میاں محمد، خداداد، مبارک تالپور اور دیگر افراد نے باضابطہ طور پر بٹائی تحریک میں کام کرنے کے لئے اپنا نام لکھوا دیا۔ غلام محمد لغاری اور مولوی عزیز اللہ نے نام تو لکھایا لیکن عملی طور پر تحریک میں شریک نہیں ہوئے۔

سرہاری کے قریب ایک زمیندار بھاون داس رہتا تھا۔ وہ ساری فصل اپنے پاس رکھ لیتا تھا، اور ہاریوں کو بس اتنا اناج دیتا تھا کہ وہ سسک سسک کر جیتے رہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے میں، خداداد، میاں محمد اور مبارک تالپور اس کے پاس پہنچے اور مطالبہ کیا کہ وہ ہاریوں کا حق ان میں تقسیم کر دے۔ ملا محمد بروہی نے اس کی سفارش کی کہ بٹائی نہ کرواؤ۔ لیکن ہم نے اس سے کہہ دیا کہ تم بیچ میں نہ آؤ۔ جب زمیندار نے ہماری باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا تو ہم نے بزور فصل کا نصف حصہ ہاریوں میں تقسیم کر دیا۔ اور اس سے کہا کہ اگر تم اپنا حصہ نہیں اٹھاؤ گے تو ہم اسے بھی کسانوں میں تقسیم کر دیں گے۔

اسی طرح میرآچن کے مشرق میں بھاول مل نامی ایک زمیندار تھا، جو ہاریوں پر بے طرح مظالم ڈھاتا تھا۔ ہمیں خبر ملی تو ہم اس کے پاس گئے اور بٹائی کا مطالبہ کیا۔ اس نے اپنی مدد کے لئے اپنے دو تین سکھ دوستوں کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو سب کو سانپ سونگھ گیا اور اس طرح ہم نے وہاں بھی کسانوں میں اناج تقسیم کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے ہماری تحریک کا زور بڑھنے لگا۔ لوگ ہمیں "سُرخ جھنڈے والے" کہتے تھے، کیونکہ جب ہم کہیں جاتے تھے تو ہمارے ہاتھوں میں سُرخ جھنڈے ہوتے تھے۔ زمیندار ہمارے سُرخ جھنڈے دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ اور انہیں جب ہماری آمد کی اطلاع ملتی تو ڈر کے مارے خود ہی بٹائی کر لیتے۔

گُنجانی میں بالاچ بروہی شہید کے گاؤں میں ایک زمیندار رہتا تھا۔ وہ ہندو دیوان تھا۔ وہ اب تک ہاریوں کو ان کا حق دینے سے گریز کر رہا تھا۔ ہمیں اطلاع ملی تو ہم وہاں جا دھمکے۔ کوئی ترازو دستیاب نہیں ہوئی تو ہم نے ایک ڈبے سے اناج کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔

'نئی زرعی اصلاحات سے ہاریوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا'

سرہاری میں گلّن خاں مگسی نامی ایک زمیندار رہتا تھا۔ یہ زمیندار بہت مکار تھا۔ وہ ہاریوں میں سڑا ہوا اناج تقسیم کرتا تھا اور اچھا اناج خود اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔ ہم ڈاکٹر کو اپنے ساتھ لے کر گئے اور تمام برتن کھول کر اسے دکھلائے۔ چنانچہ ڈاکٹر نے یہ فیصلہ کیا کہ اناج کھانے کے قابل نہیں ہے۔ ہم نے گلّن خاں کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ کسانوں میں اچھا اناج تقسیم کرے۔ ہماری اس کامیابی سے ہاریوں کے دل بڑھ گئے۔ یہ زمیندار اتنا طاقتور اور ظالم تھا کہ جب ہم سرہاری گئے تھے تو اس کے ڈر سے ہمارے رشتہ داروں تک نے ہمیں اپنے پاس ٹھہرانے سے انکار کر دیا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک ہندو ڈاکٹر نے ہمیں اپنے پاس ٹھہرایا۔ یہ زمیندار اتنا ظالم تھا کہ وہ سرِعام یہ کہتا تھا کہ اگر کسان یہ سڑا ہوا اناج کھانے سے انکار کریں تو انھیں..... کھلاؤ۔ لیکن ہم نے اس کے غرور کو خاک میں ملا دیا اور اسے کسانوں کا حق دینے پر مجبور کر دیا۔

ہم نے میاں محمد کو سکرنڈ بھیجا کہ وہ وہاں بٹائی تحریک کو مضبوط بنائیں۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک پورے سندھ میں پھیل گئی۔ پھر یہاں شہدادپور کے شوکت صاحب کو بھیجا گیا کیونکہ میں ان پڑھ تھا۔ اور وہ لکھنے پڑھنے کا کام سنبھال سکتے تھے۔ اس کے بعد ہم نے شہدادپور کے ایک زمیندار پر دھاوا بولا (میں اس کا نام بھول گیا ہوں)۔ ہم نے سنا تھا کہ وہ بہت خود سر اور مغرور ہے۔ وہ اعلانیہ یہ کہا کرتا تھا کہ سُرخ جھنڈے والے تو کیا، میں دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے نہیں ڈرتا۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ چھُپ گیا۔ اس کے ساتھ پولیس والے بھی تھے۔ جو ہماری آمد کی اطلاع سُن کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کسانوں نے ہمیں اپنے گھروں میں چھپا لیا اور اس زمیندار کے پاس پہنچ کر اس سے کہا، تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو، یہاں تو کوئی نہیں آیا۔ جب یہ سُن کر زمیندار باہر آیا تو ہم اس کے سامنے آ گئے۔ وہ گھبرا گیا اور اس طرح وہاں بھی ہم نے سارا اناج دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ کسانوں کے حوالے کر دیا۔

شاہ پور میں بھی ایک ایسا زمیندار رہتا تھا لیکن وہ پہلے ہی ہم سے بہت خائف تھا۔ میں اکیلا اس کے پاس گیا۔ اس نے کہا میں تمہاری پارٹی کو دھان دُوں گا تم یہاں سے چلے جاؤ یوں بھی کسان میرے مقروض ہیں۔ میں نے اس سے کہا تم ابھی بٹائی کر دو، وہ کٹائی کے بعد تمہارا قرض چکا دیں گے۔ یہاں میں یہ بھی بتا تا چلوں کہ چونکہ عام طور پر کسان پڑھ لکھ نہیں سکتے تھے اس لیے زمیندار حساب کتاب میں گھپلا کرتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر بھالو مل دلوان یہ کہا کرتا تھا کہ کسان میرے مقروض ہیں لیکن جب تھانیدار کو بلایا گیا اور حساب ہوا تو پتہ چلا کہ الٹا زمیندار کسانوں کا مقروض ہے۔ اس قسم کی بدمعاشیاں عام تھیں۔

اس واقعہ کا اثر میرپور پر بھی پڑا۔ چنانچہ وہاں بھی بٹائی کی تحریک شروع ہوئی۔ قادیانیوں کی ایک اسٹیٹ تھی مائی بختاور شہید وہیں کی رہنے والی تھی۔ اس وقت اس کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ کٹائی ہو چکی تھی۔ گاؤں کے تمام لوگ ہاری کمیٹی کے جلسہ میں گئے ہوئے تھے۔ زمیندار نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ سارا اناج اٹھا لیں۔ جب وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ اناج کے ذخیرے کے پاس پہنچا تو مائی بختاور نے کہا "آدھا اناج کسانوں کا ہے، تم سارا اناج نہیں لے جا سکتے لیکن وہ اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ مائی بختاور اناج کے ڈھیر پر لیٹ گئی تو زمیندار نے اس کا بدن گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ اور زمیندار کے گرگے اس کے لہو میں تر گندم اٹھا کر لے گئے——!

ایک دفعہ، ہم سرہاری کے ایک زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ہم سے اتنا خائف تھا کہ جب ہم وہاں پہنچے تو اس نے ہمارے گھوڑوں کی باگ پکڑ کر خود اپنے ہاتھ سے انہیں کھونٹوں میں باندھا۔ جب ہم نے اس سے بات شروع کی تو وہ خود نیچے بیٹھا اور ہمیں اوپر بٹھایا۔ ہم نے آدھا اناج کسانوں میں تقسیم کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کا بھوسہ بھی کسانوں کو دے دیا۔ اس نے کہا "تھوڑا سا بھوسہ تو چھوڑ دو" لیکن ہم نے اس کے پاس بھوسے کی صرف ایک بوری رہنے دی۔ اس کے پڑوس میں ایک اور زمیندار حاجی اللہ ڈھایا رہتا تھا۔ وہ اس زمیندار پر بہت گرم ہوا کہ تم ان نیچ کسانوں سے مرعوب ہو گئے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ خود ہم سے خائف تھا۔

میرآچن کے پاس ایک سکھ زمیندار لچھمن سنگھ رہتا تھا وہ بڑی شیخیاں بگھارا کرتا تھا کہ سُرخ جھنڈے والے یہاں آ کر دیکھیں میں ان کی تکّا بوٹی کرا دوں گا۔ میرا سگا بھائی اس کا کمدار تھا۔ اس نے لچھمن سنگھ کی سفارش کی۔ لیکن میں نے اس سے کہا تم بیچ میں مت پڑو۔ میں خداداد احمد، میاں محمد اس کے پاس گئے اور بزور اس کا آدھا اناج کسانوں میں تقسیم کر دیا۔ وہ چراغ پا ہو گیا اور اس نے ہمیں دھمکی دی کہ اگر ایک لاکھ روپیہ بھی خرچ ہوا تو میں تم لوگوں کو قتل کراؤں گا۔ لیکن اسے اس میں کامیابی نہیں ہوئی——!

کمب لیما میں ایک زمیندار ہوت چند رہتا تھا میرا بھانجا اس کا کمدار تھا۔ ہوت چند بھی کسانوں کو ان کا حق دینے سے گریز کر رہا تھا۔ کٹائی ہوئی تو میں نے، خداداد اور میاں محمد کو اس کے پاس بھیجا اور انہوں نے اپنے سامنے آدھا اناج کسانوں کے حوالے کر دیا۔ اس پر ہوت چند بہت برہم ہوا۔ پڑوس میں اراہو نامی ایک زمیندار رہتا تھا اس سے اس کی پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ وہ اراہو کے پاس مدد لینے کے لیے گیا اور دونوں نے اپنے گرگے جمع کر کے ہاریوں کے گھروں سے تمام اناج لوٹ لیا۔ ڈاکٹر آشا رام نے اس واقعہ کی رپورٹ نواب شاہ میں کی۔ تحقیقات ہوئی اور ہوت چند کی کتاب ضبط ہو گئی۔ بعد میں مقدمہ چلا اور ہوت چند اپنے پیسوں کے زور پر جیت گیا۔

غرضیکہ تحریک پورے زور شور کے ساتھ سندھ کے کونے کونے میں پھیل چکی تھی۔ اس زمانے میں یہاں ایک اخبار صداقت نکلا کرتا تھا جس کے ایڈیٹر لاڑکانہ کے جمال دین بخاری تھے۔ اس اخبار نے ہماری تحریک کو آگے بڑھنے میں بڑی مدد دی۔ اس اخبار میں باقاعدہ بٹائیوں کا اعلان کیا جاتا تھا کہ فلاں دن فلاں جگہ پر بٹائی ہو گی۔

بٹائی تحریک زوروں پر تھی اور سرکاری مشینری کو اس بات پر بڑی تشویش تھی کہ ہاریوں کی اس تحریک سے ان کی حیثیت اور اختیارات کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ چنانچہ حکومت نے اس تحریک کو کچلنے کے لیے میرا، خداداد محمد میاں، آشا رام اور ضلع نواب شاہ کی ہاری کمیٹی کے صدر مولوی معاذ اللہ کے وارنٹ جاری کر دیئے کہ، ہم زمینداروں کی حق تلفیاں کر رہے ہیں۔ عبدالقادر کو جو صُوبے کے صدر تھے، معلوم ہوا تو انہوں نے ہمیں کراچی بلا بھیجا۔ ہم اپنے ساتھ بٹائی کے واقعات کا پورا ریکارڈ لے گئے۔ جب ہم کسی جگہ بٹائی کرتے تھے تو ایک کاغذ پر گواہ کے طور پر دو دو آدمیوں کے انگوٹھے لگوا لیتے تھے کہ تقسیم منصفانہ ہوئی ہے۔ ہم نے وزیر اعلیٰ

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں

- لاہور میں صدر کا "عوامی دربار" منعقد نہ ہو سکا
- گورنر پنجاب کے جوڑ توڑ میں معراج خالد شرکت نہیں کرتے

نیو دہلی کے ایک ہفت روزہ "لنک" میں پاکستان کی سیاسی صورتحال کے بارے میں ایک طویل جائزہ شائع کیا گیا ہے ہم اس کے چند اہم اقتباسات پیش کر رہے ہیں تاکہ بھارت کی سوچ کا اندازہ لگایا جا سکے۔ (ادارہ)

عوام کے مقبول رہنما

بھٹو — عوام سے خائف ہیں

بھٹو صاحب کے اقتدار میں آنے کے بعد عوام کو اُمید ہو چلی تھی کہ پاکستان اندرونی اور بیرونی طور پر بعض اہم اور سنگین مسائل سے چھٹکارا حاصل کرنے میں جلد کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن دس گیارہ ماہ کی طویل مُدّت گزرنے کے بعد بھی سارے مسائل جُوں کے توں پڑے ہیں اور عوام کے دلوں میں نئی تمناؤں اور اُمیدوں کے جو چراغ جل اُٹھے تھے۔ ایک کے بعد ایک دوبارہ بجھنے لگے۔ پورے ملک میں عدم تحفّظ اور بے اطمینانی کی لہر سر نو دوڑنے لگی۔ شملہ مُعاہدہ بلاشبہ موجودہ حکومت کی ایک قابلِ قدر کوشش تھی۔ اور عام طور پر یہ خیال جڑ پکڑنے لگا تھا کہ بھارت کے جنگی کیمپوں میں پڑے ہوئے ترانوے ہزار فوجی بہت جلد اپنے گھروں کو واپس لوٹ جائیں گے۔ بھارتی فوج مغربی پاکستان کے ان علاقوں کو خالی کر دے گی۔ جن پر دسمبر کی جنگ کے دوران قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن کشمیر میں کنٹرول لائن کے تعیّن کے سلسلے میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوئیں ان سے شملہ مُعاہدے کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ واہگہ سرحد پر پاکستان اور بھارت کے فوجی کمانڈروں کی جو بات چیت چل رہی تھی۔ اس میں تعطّل پیدا ہو گیا۔ بھارت نے کشمیر میں کنٹرول لائن کے تعیّن کی تکمیل کے بغیر مغربی پاکستان کے مقبوضہ علاقوں سے اپنی فوج واپس بلانے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسری طرف ترانوے ہزار فوجیوں کی واپسی کے سلسلے میں بھارت نے یہ موقف اختیار کر کے کہ جب تک پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرتا، پاکستانی جنگی قیدی واپس نہیں کئے جائیں گے۔ بھٹو حکومت کی پوزیشن کو ہلا کر رکھ دیا۔

اندرونی طور پر بھی نو دس ماہ کی مدّت میں بھٹو حکومت مضبوط اور مستحکم ہونے کی بجائے کمزور اور متزلزل نظر آتی ہے۔ سابق وزیر قانون محمود علی قصوری نے اُصولوں کی بنیاد پر استعفیٰ دے کر حکومت کے غیر جمہوری کردار کو بے نقاب کر دیا۔ ملک میں بڑھتے ہوئے جمہوری حقوق کی بحالی کے رجحان کا مقابلہ کرنے کے لئے موجودہ حکومت نے دائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں سے گٹھ جوڑ کرنے کی کوشش کی۔ ادھر پاکستان پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے قومی اسمبلی کے ۲۵ سینئر اراکین نے سابق وزیر قانون محمود علی قصوری کی حمایت کر کے قومی اسمبلی میں مسٹر بھٹو کی پوزیشن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ حکومت نے اسی نئی اور سنگین صورت حال سے نمٹنے کے لئے اپنی توپ کا دہانہ ولی نیپ کی جانب موڑ دیا۔ نشر و اشاعت کے سرکاری ذرائع نے اس بحران کا رُخ موڑنے کے لئے شیخ مجیب الرحمان کے خلاف بھی پروپیگنڈہ کی ایک نئی مہم شروع کر دی گئی۔

پاکستان کے بارے میں مذکورہ بالا سیاسی جائزہ نیو دہلی کے ہفت روزہ "لنک" میں شائع کیا گیا۔ جس کا خلاصہ ہے کہ بھٹو حکومت اندرونی اور بیرونی طور پر سیاسی مسائل حل کرنے میں ناکام ہو گئی۔ بھٹو صاحب جو کبھی لاکھوں افراد کے اجتماعات سے خطاب کرتے تھے۔ اب پنجاب کے دھڑکتے ہوئے دل لاہور شہر میں ان کے لئے عوامی جلسے سے خطاب کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

ہفت روزہ لنک نے انکشاف کیا ہے کہ لاہور کے تازہ ترین دورے میں مسٹر بھٹو کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ کبھی مسٹر بھٹو کی آمد پر لاہور ائر پورٹ پر لاکھوں افراد "شہد" کی مکھیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے۔ اس بار وہ پرشکوہ منظر دیکھنے میں نہیں آیا۔ ٹرسٹ کے روزنامہ امروز نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا۔ ٹیلی ویژن نے صدر کی آمد اور روانگی کا آنکھوں دیکھا حال نشر نہیں کیا۔ لاہور میں آمد کے بعد صدر بھٹو کو چند گنے چنے اخباری نمائندوں سے ملایا گیا۔ روانگی سے قبل انہوں نے پارٹی کے کارکنوں کی ایک مختصر سی تعداد سے خطاب کیا۔ عوام کی نبض پر ہاتھ رکھنے والے مقبول رہنما کو شاید اس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ اب وہ مقبولیت کی معراج سے تیزی سے نیچے اُتر رہے ہیں۔ اگر وہ ابھی تک کسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں تو مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے حالات ان کے لئے انتہائی تلخ ثابت ہوں گے۔

اقتدار حاصل کرنے کے بعد مسٹر بھٹو اب تک کوئی قابل ذکر پبلک میٹنگ سے خطاب نہیں کر سکے۔ ائیر مارشل اصغر خاں اعلانیہ انہیں چیلنج دے رہے ہیں کہ وہ لاہور آ کر اپنی مقبولیت اور طاقت کا اندازہ لگائیں۔ صدر بھٹو کی لاہور میں آمد سے چند روز قبل پیپلز پارٹی کے ترجمان روزنامہ مساوات نے اعلان کیا تھا کہ صدر بھٹو لاہور میں تاریخی جلسہ عام سے خطاب کریں گے۔ لاہور کے ایک دوسرے اخبار نے بس کے ایسے کنڈکٹروں کے نام بتائے جنہیں گورنر پنجاب جناب مصطفیٰ کھر نے شہر کے مختلف علاقوں سے لوگوں کو جلسہ گاہ میں لانے کا حکم دیا تھا صدر کے "عوامی دربار" کو ہر اعتبار سے کامیاب بنانے کے لئے خاص انتظامات کئے گئے تھے۔ لیکن ان تمام انتظامات کے باوجود صدر بھٹو کا لاہور کا دورہ حد درجہ مایوس کن اور ناکام رہا۔ وہ مشکل سے گورنمنٹ ہاؤس سے باہر نکلیں۔ اور اپنی ملاقاتوں کا سلسلہ محدود رکھا گورنر پنجاب مصطفیٰ کھر صدر بھٹو کے خاص آدمی سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن وہ صدر سے جتنے قریب ہیں۔ پنجاب کے عوام سے اتنے ہی دُور ہیں۔ لاہور کی دیواروں پر جگہ جگہ نعرے

الفتح

درج ہیں "میٹرک گورنر نہیں چاہیئے" کھر صاحب نے محمود علی قصوری کے چیلنج کا جواب دینے کے لئے اندرونی مہم شروع کردی ہے۔ اور حکومت کے اہم وزراء سے طول طویل خفیہ مذاکرات کر رہے ہیں۔ ان مذاکرات میں چیف منسٹر معراج خالد شرکت نہیں کرتے۔ کھر صاحب کی اس اندرونی اور خفیہ میٹنگوں میں مولانا کوثر نیازی اور دائیں بازو کی سوچ رکھنے والے دوسرے وزراء بڑے جوش و خروش سے حصّہ لے رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ محمود علی قصوری کی سیاسی سرگرمیوں کو غیر موثر بنانے کے لئے مصطفیٰ کھر نے صدر بھٹو کو مشورہ دیا کہ

میٹرک گورنر نہیں چاہیئے لاہور کی دیواروں پر نعرہ

انہیں پی پی پی کی رکنیت سے خارج کردیا جائے۔ لیکن صدر بھٹو نے اس تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا کہ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ قصوری کو پیپلز پارٹی سے خارج کرنے کے باوجود انہیں اسمبلی کی سیٹ سے نہیں ہٹایا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس حرکت سے ہماری کمزوری ظاہر ہوگی۔"

پیپلز پارٹی کو اندرونی اور بیرونی طور پر جن خطرناک حالات کا سامنا ہے۔ ان سے مقابلہ کرنے کے لئے لاہور میں نئی حکمت عملی تیار کی گئی ہے۔ اور اس پر عمل درآمد بھی شروع کردیا گیا ہے۔ مرکزی وزیر داخلہ قیوم خان اور دوسرے رجعت پسند وزیروں نے اپنا کام شروع کردیا ہے۔ "ولی خان کو بیرونی طاقت کا ایجنٹ قرار دیا جارہا ہے۔ اور ان پر الزام لگایا جارہا ہے کہ وہ پاکستان کو مزید ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازشیں کررہے ہیں سرکاری ذرائع اس کی تشہیر میں لگے ہوئے ہیں۔ لاہور کی تیار کردہ پالیسی اور حکمت عملی اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ سرحد کی صوبائی اسمبلی کے ارکان کے درمیان غلط فہمی پیدا کی جارہی ہے۔ اگر یہ ترکیب کامیاب ہوگئی تو سرحد کی صوبائی حکومت کو آسانی سے معطل کیا جاسکتا ہے۔ اگر اسلام آباد اپنی اس مہم میں ناکام ہوگیا تو پھر صوبائی حکومت کو "ملک دشمن عناصر" کی حوصلہ افزائی کے الزام کے تحت معطل کرنے کا جواز پیدا کیا جائے گا۔ صدر بھٹو ذاتی طور پر بلوچستان نیپ اور سرحد نیپ کے درمیان تنازعہ پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ملک میں اس قسم کی باتیں بھی سننے میں آرہی ہیں کہ گورنر بلوچستان میر غوث بخش بزنجو صدر بھٹو کے بہت قریب آچکے ہیں۔ بزنجو پارٹی کے کارکنوں پر زور دے رہے ہیں کہ فوجی آمریت کے مقابلے میں صدر بھٹو کی حمایت کی جائے۔ بزنجو کی تھیوری ہے کہ اگر نیپ نے صدر بھٹو کو اپنے اعتماد میں نہیں لیا تو وہ دائیں بازو والوں سے زیادہ قریب ہوجائیں گے اور فوج کی مدد سے وہ نیپ کی صوبائی حکومتوں کو توڑ دیں گے۔

دوسری جانب نیپ کے رہنما ولی خان اس خیال کے حامی ہیں کہ بائیں بازو اور اعتدال پسند سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک وسیع تر متحدہ محاذ بنایا جائے اور کونسل مسلم لیگ، اور تحریک استقلال کو بھی شریک کیا جائے۔ صدر بھٹو کا اندازہ ہے کہ بزنجو گروپ اس معاملے میں ولی خان کا ساتھ نہیں دے گا۔ اس طرح پختون لیڈروں کو اکیلا کرکے پختونستان تحریک کو مکمل طور پر اور ہمیشہ کے لئے کچل دیا جائے گا۔ پتا چلا ہے کہ تحریک استقلال کے رہنما اصغر خان اور سردار شوکت حیات نے اس کی حامی اس وجہ سے نہ بھری کہ مغربی پاکستان میں بھی مشرقی پاکستان جیسے خطرناک حالات پیدا ہونے کے امکانات تھے۔

ہم قارئین کرام کے ممنون ہیں

قیمت میں اضافے کی ذمہ داری

وزیر اطلاعات کوثر نیازی پر عائد ہوتی ہے

قارئین کرام کی اکثریت نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ الفتح کے صفحات میں کمی نہ کی جائے۔ بلکہ قیمت بڑھا کر ۷۵ پیسے کردی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں قارئین کرام کے جتنے خطوط ملے ہیں، ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں لکھا کہ موجودہ قیمت برقرار رکھی جائے۔ تاہم اشاعتِ خصوصی کی قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے سے ایک روپیہ مقرر کرنے پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔

ہم اپنے قارئین سے قیمت میں اضافے کی تجویز پر رائے، کاغذ کی گرانی، وزارتِ اطلاعات کی جانب سے الفتح کے سرکاری اشتہارات بند کرنے، سرکولیشن کا آڈٹ سرٹیفکیٹ جاری کرنے سے گریز، نئے سرے سے سرکولیشن آڈٹ کرنے سے مسلسل انکار اور نیوز پرنٹ پر پابندی سے پیدا ہونے والی گوناں گوں مشکلات کے پیش نظر مانگی تھیں۔ واقعتاً ایسے حالات پیدا کردیئے گئے ہیں کہ، یحییٰ خان کے دور میں بھی ایسا سلوک نہیں ہوا تھا۔

ہم خوش ہیں کہ ہمیں صدر بھٹو کے دور میں بھی حق گوئی کی سزا مل رہی ہے۔ اب سزا کا فیصلہ ملٹری کورٹ کا کوئی میجر، کرنل یا بریگیڈیر نہیں دے رہا۔ بلکہ اس کا فیصلہ اب وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی کے ہاتھ میں ہے۔ انہیں غلط فہمی ہے کہ اس طرح الفتح بند ہوجائے گا۔ شاید انھیں یہ بات یاد نہیں رہی کہ الفتح کے کارکن یحییٰ کی بدترین آمریت کا مقابلہ کرچکے ہیں۔ یہ دور بھی کٹ جائے گا۔ ہم اور ہمارے قارئین حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔

الفتح کی قیمت میں ۲۵ پیسے کا اضافہ دراصل الفتح کو زندہ رکھنے کے لئے قارئین کا ایثار ہے لہٰذا قارئین کی طرف سے تجویز کردہ یہ اضافہ الفتح کی قیمت میں آئندہ شمارہ سے کیا جائے گا۔ ادارہ اس تعاون کے لئے قارئین کرام کا ممنون ہے۔

الفتح رپورٹ

کابل میں نام نہاد پختونستان کی آزادی کے لئے متحدہ محاذ قائم کر دیا گیا

خوشحال خان لائسی کالج میں خفیہ جلسے ہو رہے ہیں

کابل میں پاکستان کو ایک بار پھر ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور اس پر ایک آخری ضرب لگانے کی تیاریاں جاری ہیں۔

افغانستان کے روزنامہ "کاروان" اور دوسرے اخبارات میں آئے دن پاکستان کے خلاف زہر اگلا جا رہا ہے۔ اور نام نہاد "بلوچستان و پختونستان قومی محاذ آزادی" کے چھاپہ ماروں کو یہ مژدہ سنایا جاتا ہے کہ ان کی بے مثال اور مسلسل "قربانیاں" رنگ لانے والی ہیں۔ بلوچستان اور پختونستان کے عوام پاکستان کے ظالمانہ شکنجے سے نجات حاصل کر کے ایک نئی آزاد اور خود مختار مملکت کی بنیاد ڈالیں گے۔ آزادی کے متوالے اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کر دیں گے۔

کاروان، افغانستان کے دارالخلافہ کابل سے نکلنے والا ایک روزنامہ ہے۔ جو عام طور پر پاکستان کے خلاف اور پختونستان و بلوچستان کی نام نہاد تحریک آزادی کے بارے میں جھوٹی خبریں گھڑ گھڑ کر شائع کرتا رہتا ہے۔ اس اخبار کو عام طور پر نام نہاد قومی آزادی بلوچستان و پختونستان کا ترجمان بھی کہا جاتا ہے۔ اس اخبار کے ایک حالیہ شمارے میں نام نہاد تحریک کے متعلق بے بنیاد اور من گھڑت خبروں پر مشتمل ایک ایسا زہریلا مضمون شائع کیا گیا۔ جسے دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ کابل کلکتہ بن گیا ہے اور مشرقی پاکستان کے بعد اب بچے کھچے پاکستان کی تکہ بوٹی کرنے کے لئے بعض بڑی طاقتیں سابقہ عمل دہرا رہی ہیں۔ اندرونی اور بیرونی طور پر اس مذموم اور مکروہ سازش کے توڑ کے لئے حکومت کی مشینری کیا کام کر رہی ہے اس کے متعلق پاکستان عوام ابھی تک اندھیرے میں رکھے گئے ہیں۔ افغانستان میں پاکستانی سفارتخانہ کیا کر رہا ہے؟

اس کا ایک سیدھا سادا جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ سفارتی سرگرمیوں کو موثر بنانے کی بجائے پورا عملہ روائتی انداز سے گلچھرے اڑانے میں مصروف ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا، اور افغانستان میں پاکستانی سفارت خانے کا عملہ دیانت داری اور سائنٹفک انداز سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہوتا تو شاید کابل سے نکلنے والے اخبار میں پاکستان کی سالمیت کے خلاف ایسے زہریلے اور گمراہ کن مضامین ہرگز شائع نہ ہوتے۔

"بلوچستان و پختونستان، قومی محاذ آزادی" کی تحریک کا کوئی وجود نہیں ہے۔ پاکستان کے کسی علاقہ، بالخصوص بلوچستان اور سرحد میں اس کا نام و نشان نہیں ہے۔ لیکن کابل میں اس نام نہاد کاغذی تحریک کو اخبارات اور دوسری پروپیگنڈا مشینری کے ذریعہ ہوا دی جا رہی ہے۔ اس کے پیچھے مٹھی بھر نوجوان بعض بین الاقوامی طاقتوں کے اشارے پر پاکستان کے خلاف سازش کر رہے ہیں اور اس بات کا زور و شور سے پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ بلوچستان اور پختونستان کے عوام علیحدہ ریاست کے قیام کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں۔ اس پروپیگنڈہ مہم کا مقصد اندرون ملک اور بیرون ملک رائے عامہ کو بتدریج ہموار کر کے ایک دن سازش کو عملی شکل دینا ہے۔ یہ منصوبہ شیخ مجیب کے چھ نکات کے پیچھے خفیہ طور پر کام کرنے والوں کے ہاتھ سے کم خطرناک نہیں ہے۔ عزائم وہی ہیں، انداز وہی، ممکن ہے حالات کے ساتھ اس کی حکمت عملی میں تھوڑی بہت تبدیلی پیدا کر لی جائے۔

چند سال پیشتر کابل کے ایک کالج "خوشحال خان لائسی" میں مٹھی بھر نوجوان اکٹھا ہوئے۔ دعویٰ یہ کیا گیا کہ ان کا تعلق بلوچستان اور پختونستان سے ہے۔ مگر وہ پاکستان کے باشندے نہیں تھے۔ انھوں نے بلوچستان اور پختونستان کی آزادی کے لئے ایک "یونائیٹڈ فرنٹ" بنا ڈالا اور عہد کیا کہ وہ اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے اپنی ہر چیز قربان کر ڈالیں گے اس واقعہ کے بعد متعدد بار خوشحال خان لائسی کی حدود

میں میٹنگیں کی گئیں۔ اور ہر میٹنگ کی کارروائی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ اخبارات میں کارروائی کی روداد کے علاوہ ایسے مضامین شائع کئے گئے جیسے "بلوچستان اور پختونستان کے نام پر کوئی طوفان خیز مہم چل رہی ہے۔ اور پوری دنیا کو اس کی تائید و حمایت کرنی چاہیئے۔ حالانکہ واقعات اسکے بالکل برعکس ہیں۔ خوشحال خاں لائسی میں جتنے اجلاس ہوئے انہیں اجلاس کہنا تو کجا معمولی نشست کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا۔ چند گنے چنے افراد کے علاوہ باہر کا کوئی آدمی اس ڈھول کے پول میں فٹ نہ ہوا۔

روزنامہ کاروان میں نام نہاد قومی محاذ آزادی "بلوچستان و پختونستان" کے عنوان سے جو مضمون شائع کیا گیا ہے، اس کے آخری پیراگراف میں پاکستان کی وحدت اور سالمیت پر بڑے واضح طریقہ سے ضرب لگاتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

" افغانستان میں رہنے والے پختون اور بلوچی "پختونستان اور بلوچستان" کی آزادی کی زبردست حمایت کرنے کے علاوہ نیپ کی جانب سے پختونستان اور بلوچستان کی آزادی قومی اور جمہوری آزادی کی جدوجہد کی بھی بھرپور حمایت کرتے ہیں"

نیپ کا کردار

نیپ کے رہنماؤں کا کردار عوام کے لئے ایک کھلی کتاب ہے۔ انھوں نے ہر موقع پر اپنے پس پردہ عزائم کو بے نقاب کیا۔ اس بات کی کوشش کی گئی کہ کسی طرح پاکستان کے حصے بخرے کر دیئے جائیں، شیخ مجیب کی حوصلہ افزائی میں نیپ نے جو کام کیا کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ پختونستان کا اسٹنٹ بھی اسی کا کھڑا کیا ہے۔ لیکن جب عوام کی اکثریت نے نیپ کے ارادے کو بھانپ لیا اور ٹھکرا دیا تو مجبوراً انہیں جمعیت العلمائے اسلام کا سہارا ڈھونڈنا پڑا۔ اور اپنے خطرناک عزائم پر پردہ ڈالنے کے لئے صوبائی خودمختاری اور جمہوری آزادی کی جدوجہد کا ڈھونگ رچایا۔ بلوچستان اور سرحد میں حکومت بنانے کے بعد نیپ نے اپنی سیاسی حکمتِ عملی میں تبدیل کر لی۔ پختونستان کی تحریک کو ہوا دینے کی بجائے زیادہ سے زیادہ صوبائی خودمختاری کا نعرہ بلند کیا گیا۔ نیپ کے سربراہ ولی خاں نے اعلان کیا کہ پختونستان کی تحریک سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ پاکستان کی سالمیت پر کامل یقین رکھتے ہیں؛ لیکن حالات اور واقعات بتا رہے ہیں کہ کابل میں بعض بڑی طاقتوں کے اشارے پر جو کھچڑی پکائی جا رہی ہے اس میں نیپ، پوری نہیں تو اس کا ایک دھڑا آلہ کار بنا ہوا ہے۔

افغانستان میں "نام نہاد پختونستان اور بلوچستان قومی محاذِ آزادی" کے نقاب پوش رہنما اصولوں کی بنیاد پر نیپ اور جمعیت العلمائے اسلام کو سپورٹ کرتے ہیں، ان کے خیال میں نیپ اور جمعیت دونوں پاکستان میں مذکورہ "کاغذی تحریک" کی حمایت کرتے ہیں۔ "متحدہ محاذ" بلوچستان اور پختونستان کی قومی تحریک کے "عظیم رہنما" باچا خان کی خدمات کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتا ہے، اور ان کے تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا دعویٰ کرتا ہے؛ کارواں میں آگے چل کر نیپ کے رہنما ولی خاں کو بھی پختونستان اور بلوچستان کی آزادی کے سلسلے میں ان کی غیر معمولی خدمات پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے ہیں۔ اور ان کی قومی اور جمہوری جدوجہد کی زبردست حمایت کی گئی ہے۔

مضمون میں اس جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ابھی یہ تحریک پوری شدومد کے ساتھ جاری نہیں ہے۔ پختونستان اور بلوچستان کی آزادی کی حمایت کرنے والے ایک پلیٹ فارم پر متحد و منظم نہیں ہوئے ہیں، متحدہ محاذ نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا ہے کہ "وہ آزادی کے ان متوالوں" کو یکجا کرے گا۔ اور انہیں ایک لڑی میں پرو کر سیاسی جدوجہد کی راہ پر لگائے گا"

افغانستان کے شہر کابل میں نام نہاد متحدہ محاذ کا عملاً کوئی وجود نہیں ہے۔ نہ ہی اس قسم کی کسی تحریک کی اندرون ملک کوئی خبر ہے۔ فی الوقت پاکستان کے خلاف یہ ایک کاغذی سازش ہے۔ جسے بعض پاکستان دشمن بین الاقوامی طاقتیں وقت اور حالات کے مطابق استعمال کریں گی۔ نیپ کے متعلق پورے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کہاں تک اس کاغذی سازش میں شریک ہے، البتہ اس کا ماضی شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے کہ پوری نیپ نہیں تو اسکے چند رہنما "کابل پلان" سے قریب ہیں۔ اگر وہ بورژوا جمہوری طریقہ سے اپنے سیاسی مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکیں تو ممکن ہے وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہو کر خطرناک راستہ اختیار کریں۔

اس تمام تر صورتِ حال کا افسوس ناک پہلو ترین ملک، ہمارے سفارت خانوں کی ناقص اور روایتی کارکردگی ہے۔ اگر کابل میں پروپیگنڈے کی سطح پر پاکستان دشمن سرگرمیاں جاری ہیں تو پاکستان کے عوام اپنے سفارت خانے سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ اس ناپاک مہم کے جواب میں اب تک کیا کیا گیا۔؟

نسیم سحر

نجات کا عذاب

مرا بدن مر چکا تھا لیکن
مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا
کہ ایک نازک سا ہاتھ جیسے
مرے بدن کی تمام سوئیاں نکالتا ہے

انہی خیالوں میں تھا
کہ بس اب تو چند لمحوں کے بعد
میرے بدن کی ساری رگیں کہیں گی
کہ آج سے اس ہمیشگی کے عذاب کا بوجھ ہٹ چکا ہے

مگر وہ جھونکا مجھے رہائی دلا کے بھی قید کر گیا ہے
کہ میری آنکھوں کی سوئیاں تو
اُسی طرح سے چبھی ہوئی ہیں
اُسی طرح سے چبھی رہیں گی!

خان ناہید نواز

چارو مجمدار

ہند کے انقلاب کی خاطر
آخری سانس تک رہا لڑتا
جاگتی گولیوں کے جھرمٹ میں
جہدِ پیہم اصول تھا جس کا
مارکسی لیننی شعور سے لیس
تھام کر فکرِ ماؤ کا جھنڈا
سر جو روشن تھا مشعلوں کی طرح
کٹ گرا تو فصیلِ نور بنا

سورجوں کے پجاریو! سن لو
بیٹھ رہنے سے کچھ نہیں ہوتا
چھید ڈالو سیاہ شب کا بدن
کھول دو روشنی کا دروازہ

سفرنامۂ چین ۴

سُرخ پرچم نہر کے تین ہیروؤں سے ملاقات

عوام کیلئے جان دینا کوہ تھائی سے بھی وزنی ہوتا ہے



احفاظ الرحمان

کو چھیو انگ

وانگ شی شنگ

لو انگ

یہ لنگ شیئن میں میری آخری رات تھی۔

لنگ شیئن۔ جس نے فطرت کے خلاف انسانی جد و جہد کی تاریخ کا ایک نیا باب لکھا ہے۔ اور اس باب کے تین کردار میرے سامنے بیٹھے ہوتے تھے۔

میں انھیں دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ سیدھے سادے کسان تھے۔ آنکھیں تاثرات سے خالی، پھیکے پھیکے سے چہرے، جھجکتا ہوا انداز بیان۔ ان میں کوئی تو ایسی بات نہیں تھی جسے دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ انہوں نے نہر کی تعمیر کے دوران کارہائے نمایاں انجام دیئے ہونگے۔

یہ لنگ شیئن کے ہیرو تھے۔

میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنے تجربات سے آگاہ کریں۔

وانگ شی شنگ نے پہل کی۔

وانگ شی شنگ ایک ان پڑھ کسان ہیں۔ آزادی کے بعد جب پارٹی نے یہاں شبینہ مدرسہ کھولا تو وہ وہاں تعلیم حاصل کرنے لگے اور اب وہ اخبارات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ان کی عمر اس وقت ۴۳ سال ہے۔ وہ ۱۹۵۳ء میں پارٹی کے رکن بنے تھے۔ وہ جاپان کے خلاف جنگِ مزاحمت کے دوران گوریلا جنگ میں حصّہ لے چکے ہیں۔ لیکن چونکہ اس وقت وہ نوعمر تھے، اس لئے محض گوریلوں کو رسد پہنچانے کا کام سرانجام دیتے تھے۔ پرانے سماج کے تلخ مصائب انھیں آج بھی یاد ہیں۔ ان کا ذکر کرتے وقت اُن کی ٹھہری ٹھہری آنکھوں میں غم و غصّے کا طوفان امڈنے لگا۔ ان کے باپ دادا غریب کسان تھے۔ اور انہیں دو وقت روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ زمینداروں کے آگے کسی کو چوں تک کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ پھر جب کمیونسٹ پارٹی نے مفلسوں اور سسکتے سروں کی آزادی کا پرچم بلند کیا تو غریب کسان پوری قوت کیساتھ اٹھ کھڑے ہُوئے اور انہوں نے استحصالی قوتوں کا صفایا کر دیا۔ ۱۹۴۴ء میں اس کاؤنٹی میں سُرخ اقتدار قائم ہوگیا۔ اور تاریخ میں پہلی بار غریب کسانوں کو خوشیوں کی جھلک دکھائی دی۔

اب وانگ شی چھنگ کا گھرانہ بہت خوشحال ہے۔ وہ پوری طرح مطمئن ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کمیونسٹ پارٹی نہ ہوتی تو ان کا گھرانہ ہمیشہ ذلت کی پستیوں میں گرا رہتا۔ ان کے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ ایک بیٹی مڈل اسکول کی طالبہ ہے اور باقی بچے کام کرتے ہیں۔

نہر کی تعمیر سے قبل وانگ شی چھنگ ایک عام کمیون ممبر تھے۔ اس کے بعد وہ پیداواری بریگیڈ کے ڈپٹی سیکرٹری بنے۔ اور آج وہ پارٹی برانچ کے ممبر ہیں۔

"میں نے سُنا ہے آپ نے نہر کی تعمیر کے دوران بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ آپ ہمیں اپنے تجربات سے آگاہ کریں۔ تاکہ پاکستانی عوام آپ سے سیکھنے کی کوشش کریں۔"

وانگ شی چھنگ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ میں نے ان کی طرف سگریٹ بڑھایا۔ اور وہ اُسے سلگاتے ہُوئے بولے۔ "آج پاکستانی دوست سے مل کر ہمیں بہت خوشی ہُوتی ہے۔ پاکستان اور چین پرانے دوست ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ دنیا بھر کے عوام ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔"

اس کے بعد وہ کچھ دیر دم لینے کو ٹھہرے اور میرے مترجم کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

میں تنگ کان کمیون کے لو چائے بریگیڈ میں رہتا ہوں میں پہلے مرحلے میں ہی نہر کی تعمیر کے کام میں شامل ہوگیا تھا نہر کا اصل حصّہ پہلے پانچ سال میں مکمل ہوگیا لیکن پھر بھی پانی ہمارے کمیون سے بہت دور تھا۔ تنگ کان کمیون تک پانی لانے کے لیے نہر سے تیسری شاخ نکالنا ضروری تھا اور چونکہ وہاں راستہ سیدھا نہیں اس لیے ایک ہزار میٹر لمبی سُرنگ کھودنا ضروری تھا۔ جب یہ تجویز پیش کی گئی تو بعض کسان متذبذب ہو گئے۔ ان کے خیال میں مشینوں کے بغیر سُرنگ کھودنا بہت مشکل کام تھا اور اس میں وقت بھی زیادہ صرف ہوگا اور یہ کہ اگر بارود سے بلاسٹنگ کی جائے گی تو سرنگ میں دھواں بھر جائے گا اور بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہاں ایک پمپنگ اسٹیشن تعمیر کر دیا جائے جس کے ذریعے اس کمیون تک پانی پہنچایا جا سکے لیکن کسانوں کی اکثریت اس بات کے حق میں تھی کہ ہمیں مشکلات اور سختیوں سے مرعوب نہیں ہونا چاہئے مشینری کے استعمال اور پمپنگ اسٹیشن کی تعمیر میں زیادہ



"سُرخ پرچم نہر" کی تعمیر کا ایک منظر

سرمایہ صرف ہوگا۔ ہمارے پاس وسائل کی کمی تھی اور ہم اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

سب سے پہلے سروے کا کام شروع ہوا۔ اور غریب کسانوں، رہنما کارکنوں اور ٹیکنیشنوں پر مشتمل سہ پہلو گروپ بنایا گیا۔ ہم نے دو طرف سے کھدائی کا کام شروع کیا۔ لیکن کام کی رفتار بہت سُست تھی۔ بیک وقت سو سے زیادہ افراد کام نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ہم نے اوپر سے برابر برابر فاصلے پر ۳۴ کنویں کھودے اور اس طرح بیک وقت ستر مقامات پر کام شروع ہوگیا۔ اور تیرہ سو افراد کام کرنے لگے ان کنوؤں کی وجہ سے ہمارے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو گئے۔ دھواں خود بخود باہر نکل جاتا تھا اور اندر سے پتھر نکال کر باہر پہنچانے کا کام بھی آسان ہو گیا۔

ایک دن میں کنویں میں کام کرنے والے دوسرے اراکین کے ساتھ پچاس میٹر اندر کام کر رہا تھا کہ اوپر کی مٹی جو بہت نرم تھی دھڑا دھڑ نیچے گرنے لگی۔ اور دیکھتے دیکھتے راستہ بند ہو گیا۔ ہوا کم ہونے کی وجہ سے لالٹین بجھ گئی اور ہم اس اندھیری قبر میں محصور ہو کر رہ گئے۔ موت ہماری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی لیکن اس وقت مجھے ان جیالے فرزندوں کا خیال آیا جنہوں نے ہنسی خوشی اپنی جانیں اپنے وطن کی سربلندی کے لیے قربان کر دی تھیں۔ عوام کے لیے جان دینا کوہ تھائی (چین کا ایک پہاڑ) سے بھی وزنی ہوتا ہے اور بے مصرف زندگی پَر کی طرح ہلکی ہوتی ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں صدر ماؤ کا یہ قول یاد دلایا کہ ہمیں کسی بھی صورت میں مشکلات اور سختیوں سے خائف نہ ہونا چاہئے۔ ہم مل کر گری ہوئی مٹی کو کھودنے لگے۔ سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ لیکن ہم آخری دم تک لڑنے کا عزم رکھتے تھے۔ دوسری طرف باہر کے کامریڈوں کو بھی ہماری اس افتاد کا علم ہو چکا تھا اور وہ لوگ بھی باہر سے کھدائی کر رہے تھے۔ بالآخر ہم نے ایک سوراخ بنا لیا۔ سب سے پہلے میں نے اپنے ساتھیوں کو باہر نکلنے کا موقع دیا۔ جب میری باری آئی تو اوپر سے ایک بار پھر مٹی گرنے لگی اور میں اس کے نیچے دب گیا۔ میری ٹانگ زخمی ہو گئی۔ لیکن میرے ساتھیوں نے مجھے باہر نکال لیا۔ اس دن میں بہت خوش تھا کہ میں نے اپنے ساتھیوں کی جانیں بچالیں۔

کھدائی کے دوران سُرنگ میں برابر مٹی گرتی رہی چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ اندر شہتیر لگا دیئے جائیں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے لیے حکومت سے مدد لی جانی چاہئے لیکن ہم میں سے اکثر کی رائے یہ تھی کہ حکومت پر بار نہ ڈالا جائے، کیونکہ دوسرے علاقوں کے لوگ ہم سے زیادہ مشکلات کا شکار ہیں۔ حکومت انہی وسائل سے ان کی مدد کر سکتی ہے

ایک ان پڑھ راج 'انجینئر' بن گیا

چنانچہ ہم نے خود ہی شہتیر اور لکڑیاں جمع کیں اور سُرنگ کے اندر ستون کھڑے کر دیئے۔ ستون لگاتے وقت خطرناک مقامات سے پتھر اور مٹی ہٹانا بہت ضروری تھا اور یہ بہت پُرخطر کام تھا۔ میں نے سوچا میں ایک کمیونسٹ ہوں اس لیے سب سے مشکل کام مجھ کو کرنا چاہئے۔ کچھ لوگوں نے مجھے اس خیال سے باز رکھنے کی کوشش کی یہاں تک کہ میری بیوی نے بھی مخالفت کی کہ میں ایسا پُرخطر کام اپنے ذمے نہ لوں۔ میں عجیب سی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن جب مجھے یہ احساس ہوا کہ ماضی کے معاشرے میں ہماری زندگی جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ ہم جیتے جی مُردوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ میرے باپ کو اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے بھیک تک مانگنی پڑی خود مجھے بارہ سال کی عمر میں اپنے کھیت کے لیے پانی حاصل کرنے کی خاطر زمیندار کے چرواہے کی حیثیت سے کام کرنا پڑا۔ اور اب تو میں اپنے کسان بھائیوں کے لیے کام کر رہا ہوں اس لیے مجھے تن من دھن سے کام کرنا چاہیئے۔ چنانچہ میں اپنے فیصلے پر قائم رہا اور انتہائی مشکلات کے باوجود میں نے سُرنگ کے اندر گھس کر تمام پتھر ہٹا دیئے۔ وانگ شی چھنگ خاموش ہو گئے۔ میرے مترجم کامریڈ شوٹے انگ جے ترجمہ کر رہے تھے اور میں بڑے غور سے وانگ شی چھنگ کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا جہاں سادہ سچائیوں کے جذبے جھلک رہے تھے۔ میں نے وانگ شی چھنگ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جب اُن سے یہ کہا کہ میں نے آپ کی زندگی سے بہت کچھ سیکھا ہے تو انہوں نے بڑی منکسر مزاجی سے جواب دیا۔ "ہم ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں۔"

کو چھیوانگ ایک ۲۳ سالہ لڑکی ہے۔ جب وہ میری طرف مخاطب ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ متناسب جسم والی اس لڑکی کے چہرے پر جفاکشی کی علامات کتنے واضح طور پر نظر آ رہی ہیں۔ کو چھیوانگ لنگ شیئن کے کسانوں کی ہیروئن ہے اور کارکن لڑکیوں کے گروپ کی لیڈر ہے۔ وہ جونیئر مڈل اسکول کی تعلیم مکمل کر چکی تھی۔ کو چھیوانگ دن بھر کام کرنے کے بعد کچھ تھکی تھکی سی نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ اس کے باوجود وہ بڑی دلچسپی اور سرگرمی سے میرے سوالات کا جواب دے رہی تھی۔

میں یاؤ چھنگ کمیون کے موشان بریگیڈ میں رہتی ہوں

انھیں ۱۰۴ من اناج اور ۱۰۰ من بھوسے کے بدلے اپنے چار سالہ بچے کو فروخت کرنا پڑا

سُرخ پرچم نہر کی تعمیر میں لنگ شئین کی بہت سی عورتوں نے حصّہ لیا ہے۔ جب نہر کے اصل حصّے کی تعمیر ہو رہی تھی اس وقت میں بہت چھوٹی تھی۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں کسی طرح اس کام میں سرگرمی سے اپنا کردار ادا کرسکوں۔ جب میں بڑی ہوئی تو مجھے اپنی اس خواہش کی تکمیل کا موقع ملا۔ اس وقت نہر سے مختلف اطراف میں شاخیں نکالی جارہی تھیں۔ جب میں پہلے دن تعمیر میں حصّہ لینے گئی تو مجھ پر ایک سرخوشی کی کیفیت طاری تھی — دوسرے بریگیڈوں میں پانی پہنچ رہا تھا لیکن میرے اپنے بریگیڈ کے کھیت خشک پڑے تھے۔ جب ہمارے بریگیڈ کی طرف شاخ نکالی جارہی تھی اس وقت ایک مشکل مسئلہ پیش آیا۔ تعمیر کا سلسلہ آگے بڑھانے کے لیے ایک چار سو میٹر لمبی سُرنگ بنانا ضروری تھا ہمارے پاس جدید آلات نہیں تھے لیکن ہمارے جذبوں میں تازگی تھی۔ پانی کی قلّت کے سبب ہماری زندگی تلخ تھی۔ ہمیں پرانے سماج کے مصائب یاد تھے۔ جب زمیندار کے کھیت سیراب ہوتے اور ہمارے بچے پیاس سے بلکتے رہتے تھے۔

ہمارے بریگیڈ کے تمام افراد نے اس کام میں حصہ لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش کام کرنا چاہتی تھیں۔ چند بڑے بوڑھوں نے ہم سے کہا "بہر حال عورتیں مردوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ تم لوگ تو نالہ تک نہیں کھود سکتیں، سُرنگ کی تعمیر میں کیسے حصہ لے سکوگی!" ہم عورتیں بھی ذہنی اُلجھن میں پڑ گئیں لیکن جب ہمیں یہ احساس ہوا کہ یہ صدر ماؤ کا دَور ہے جن کا کہنا ہے کہ جو کام مرد کرسکتے ہیں وہ عورتیں بھی کرسکتی ہیں تو ہم میں اعتماد پیدا ہوگیا۔

ہمیں ٹھیک سے کدال پکڑنا نہیں آتا تھا۔ اس پر ہماری گرفت بہت ہلکی ہوتی تھی چنانچہ ہم آرام کے وقفے میں کدال چلانے کی مشق کرتی تھیں۔ اس طرح ہم بہت جلد کھدائی کے کام میں ماہر ہوگئے۔ جب بلاسٹنگ کرنے کا مرحلہ آیا تو ہم نے سوچا ہمیں بھی مردوں کی طرح سوراخوں میں بارود ڈالنے اور فلیتے کو آگ دکھانے کا کام کرنا چاہئے۔ چنانچہ ہم نے عمل کے ذریعے سیکھنے کے جذبے کے تحت بلاسٹنگ کا کام بھی شروع کردیا۔ شروع میں ہمارے گروپ میں صرف سات آٹھ لڑکیاں تھیں۔ بعد میں یہ تعداد بیس تک پہنچ گئی۔ ہم رسّے سے لٹک کر نیچے اترتیں اور بارود کو آگ دکھانے کے بعد اسے جھٹکا دیتیں اور ہمارے ساتھی ہمیں اوپر کھینچ لیتے۔ ایک بار ایک لڑکی نے جس کا نام ہان ینگ تی ہے فلیتے کو آگ دکھانے کا کام اپنے ذمے لیا۔ وہ رسّے سے لٹک کر نیچے اتری لیکن جب وہ چار سوراخوں کے بعد پانچویں سوراخ کے فلیتے کو آگ دکھانے لگی تو اس پر خوف طاری ہوگیا اور وہ زور سے چیخ اٹھی، مجھے اوپر کھینچ لو۔ جب وہ اوپر آئی تو لوگوں نے اس کی بہت تعریف کی لیکن اسے شرمندگی محسوس ہورہی تھی کہ وہ خوف کے باعث پانچویں فلیتے کو آگ نہ لگا سکی۔ چنانچہ وہ دوبارہ نیچے اُتری اور اس نے پانچویں فلیتے کو بھی آگ لگادی۔

ہم نے کام کی رفتار میں اضافہ کرنے کے لیے اُوپر سے کنویں کھودے تھے تاکہ بیک وقت کئی جگہوں سے کام کیا جاسکے لیکن جب بلاسٹنگ کی جاتی تو سرنگ میں دھواں بھر جاتا مردوں کے ساتھ ہم لڑکیاں بھی سرنگ میں اُتر کر دیسی طریقے سے کپڑوں سے دھواں نکالنے کی کوشش کرتیں لیکن یہ کام بہت خطرناک تھا۔ چند لڑکیاں دھویں کی وجہ سے بیہوش ہوگئیں۔ لیکن ہم نے حوصلہ نہ ہارا اور مستقل مزاجی سے مردوں کی طرح کام کرتی رہیں یہاں تک کہ اس پر دسترس حاصل کرلی۔

اس طرح اس سرنگ کا کام دو ماہ میں مکمل ہوگیا۔

میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کو چیوانگ نے کہا "پرانے زمانے میں عورتیں مردوں سے بھی زیادہ مظلوم تھیں انہیں کوئی سیاسی یا سماجی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ آزادی کے بعد ہم عورتوں کو بھی آزادی نصیب ہوئی اور ہمیں مردوں کے برابر حقوق حاصل ہوگئے۔ ہم صدر ماؤ اور کمیونسٹ پارٹی کے مشکور ہیں کہ ان کی بدولت ہمیں سماج میں ایک ممتاز مقام حاصل ہوگیا ہے۔ اسی لیے ہم پوری جانفشانی اور خلوص کے ساتھ سوشلسٹ تعمیر میں حصہ ادا کرنا چاہتی ہیں۔ نہر کی تعمیر کے بعد اب ہمارا پانی کا مسئلہ حل ہوگیا ہے لیکن ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا اب ہم تاچائے کی مثال" کو سامنے رکھتے ہوئے زمینوں کو ہموار کرکے پیداوار میں اضافہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ہماری جدوجہد بہت طویل ہے، یوں سمجھ لیجئے کہ ابھی تو ہمارے لانگ مارچ کا پہلا قدم شروع ہوا ہے"

اب کامریڈ لوانگ کی باری تھی۔ ۶۲ سالہ لوانگ ہو چیان کمیون کے کوچایوان بریگیڈ میں رہتے ہیں۔ ان کے بارہ پوتے



جو کام مرد کر سکتے ہیں، وہ عورتیں بھی کر سکتی ہیں (صدر ماؤ)

پوتیاں ہیں۔ انہیں اس نہر کی تعمیر کے دوران انجینئر کی حیثیت حاصل تھی حالانکہ بالکل ان پڑھ تھے اور انہوں نے کسی یونیورسٹی سے ڈگری حاصل نہیں کی تھی۔ ان کے باپ اور دادا راج کی حیثیت سے کام کر چکے تھے اور وہ خود بھی اینٹیں چُننے کا کام جانتے تھے بس اس کے علاوہ انہیں کسی قسم کا تجربہ نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے اس نہر کی تعمیر کے دوران ایک نمایاں کردار ادا کیا اور دیسی طرز کے آلات کی مدد سے تمام مراحل مکمل کر لیے۔

جب نہر کا اصل حصہ مکمل ہو گیا تو اس کی شاخوں پر کام شروع ہوا۔ میں آپ کو اس نظریاتی جدوجہد کا حال بتاؤں گا جو دوسری شاخ کی تعمیر کے دوران اُبھر کر سامنے آئی۔ سُرخ پرچم نہر کی دوسری شاخ کا بیشتر حصہ پہاڑی علاقے سے گزرتا ہے اس لیے اس علاقے میں جا بجا سرنگیں اور پل بنانا ضروری تھا ۱۹۵۸ء میں ہم نے اپنے بریگیڈ میں ایک آبی ذخیرہ تعمیر کیا تھا۔ اس ذخیرے کی اونچائی تقریباً چالیس میٹر تھی۔ چند ٹیکنیشنوں کی رائے تھی کہ ڈیم کے اوپر نہری پل بنایا جائے لیکن اس میں لکڑیوں کا خرچ بہت زیادہ تھا اور اس پر کم و بیش چالیس ہزار یوان صرف ہوتے اس لیے کمیون کے اراکین نے ان کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ پُل بنانے کی بجائے پہاڑ کے کنارے کنارے گھومتا ہوا راستہ بنایا جائے۔ اس صورت میں لمبائی میں تین سو میٹر کا اضافہ ہو جاتا اور کسانوں کو محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی۔ لیکن انہوں نے کفایت شعاری کے جذبے کے تحت حکومت کے خزانے سے کسی قسم کی امداد لینے سے انکار کر دیا۔ جب ٹیکنیشنوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی تو وہ رضامند نہیں ہوئے۔ انہوں نے کوئی نئی راہ یا رائے بھی نہیں بتائی اور خاموش ہو رہے۔ ہمارے ذہنوں میں کچھ کشمکش سی ہونے لگی۔ ہم نے سوچا یہ لوگ تعلیم یافتہ ہیں ہو سکتا ہے ان کی رائے درست ہو۔ لیکن ہم اس بات سے مطمئن تھے کہ ہم صدر ماؤ کے کفایت شعاری اور خود انحصاری کے اصول پر عمل کر رہے ہیں اس لیے ہماری راہ عمل غلط نہیں ہو سکتی۔ ہم نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔ ہم نے کہا ہم پل نہیں بنائیں گے ہمیں کھدائی زیادہ کرنی پڑے گی لیکن ہم ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔

رہنما ادارے نے ہم سے کہا کہ نوے دن کے اندر اندر کھدائی کا کام مکمل ہو جانا چاہیئے۔ اس لیے اس کے لیے عوام کو بڑے پیمانے پر متحرک کرنے کی ضرورت تھی۔ جب ہم نے کمیون کے تمام اراکین کو حالات سے مطلع کیا تو انہوں نے زبردست جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اور کہا کہ ہم اس منصوبے کو مقررہ وقت میں ضرور مکمل کریں گے۔

ایک طرف لائن سروے شروع کیا گیا اور دوسری طرف کھدائی کا کام بھی شروع ہو گیا۔ یہ انجینئری کے مروجہ اصولوں کی خلاف ورزی تھی۔ عام طور پر سروے کا کام پہلے مکمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد تعمیر کا مرحلہ آتا ہے۔ لیکن ہم گھسی پٹی روایات پر عمل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان ٹیکنیشنوں کو اطلاع ملی تو انہوں نے پوچھا، تم یہ سب کس کی اجازت سے کر رہے ہو۔ ہم نے کہا یہ کمیون اراکین، کسانوں کا فیصلہ ہے!۔ اس پر وہ چپ ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے کہا، بہر حال اب تو اپنا کام جاری رکھو۔ لیکن ذرا معیار بلند رکھنا۔ ہم نے کہا، ہم کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ ہم ایک اہم کام کر رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ لوگ بھی تعمیر میں حصہ لینے لگے۔

ہم دن رات کام میں جُتے رہے، یہاں تک کہ یہ کام نوے دن کی بجائے صرف ستر دن میں مکمل ہو گیا۔

کامریڈ لوانگ نے ۱۹۴۴ء میں کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت حاصل کی تھی۔ جاپان کے خلاف جنگ مزاحمت کے دوران وہ ملیشیا کے رکن کی حیثیت سے گوریلا جنگ میں بھی حصہ لے چکے ہیں۔ ان کے دستے کے پاس صرف چند نیزے اور چند رائفلیں اور تلواریں تھیں۔ رہنما ادارے کی طرف سے انھیں کبھی کبھار چند دستی بم بھی مل جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بڑی مستقل مزاجی سے جاپانی جارحین کا مقابلہ کرتے رہے اور بالآخر انہیں اپنی کاؤنٹی سے نکال باہر کیا۔"

آزادی سے پہلے کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا، "ہماری حالت جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ ہم سڑک پر سر اٹھا کر بھی نہ چل سکتے تھے۔ زمیندار، پولیس کے گٹھ جوڑ سے ہم پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے تھے۔ ہم کو کبھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ ایک بار غربت کے سبب مجھے اپنے ایک بچے کو جو اس وقت صرف چار سال کا تھا، ۲۵ سیر اناج اور ۵۰ سیر بھوسے کے بدلے فروخت کرنا پڑا۔"

لوانگ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے، میں نے موضوع بدلنے کے لئے ان سے سوال کیا، "آپ کا خاندان کیسے زندگی بسر کر رہا ہے؟"

"آج ہم خوشحال ہیں۔ ہمیں سماج میں بلند مقام حاصل ہے اب سیاسی اقتدار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ آج کوئی ہمارے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اب ہم بیدار ہو چکے ہیں۔ آج میرے پاس بارہ کمروں کا ایک نیا مکان ہے۔ میرے بچے اور پوتے پوتیاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس ایک سال کا اناج محفوظ ہے۔ میری تنخواہ ۴۸ یوان ہے۔ آدھی تنخواہ میری ٹیم کی طرف سے ادا کی جاتی ہے، جو ہمیں سال بھر کا اناج فراہم کرتی ہے۔"

میں نے کو چھیوانگ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔ جب میں اس طرف دیکھتا تو وہ ہڑبڑا کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگتی۔

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی مصروفیات کے باوجود مجھے وقت دیا۔" میں نے کہا، "اب آپ لوگ بہت تھک گئے ہوں گے، اس لئے میں پاکستانی کسانوں کی طرف سے سلام کرتے ہوئے آپ سے اجازت چاہتا ہوں!"

"ہم پاکستانی کسانوں کو اپنا قریبی دوست سمجھتے ہیں۔" کو چھیوانگ نے کہا، "انھیں ہماری محبت اور دوستی کا پیغام پہنچا دیں!"



ہم لوگ

ضیاء سرحدی کی یادداشتیں (۱۷)



ممتاز ھدایت کار محبوب اور وجاہت مرزا تقدیر سے خائف تھے

میرا مارکسزم کی طرف راغب ہونا

اوراس کے بعد میں نے پھر سے ایک طویل عرصہ فلم سے یکسر لاتعلق ہوکر گزار دیا۔ آزمائش اور شدید مالی مشکلات کے دور میں، سب سے اہم بات جو میرے سامنے آنے لگی، اس کو میں تقدیر پرستی کا نام دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس سے پہلے اس مسئلہ کیطرف میں نے کبھی باقاعدگی سے رجوع نہیں کیا تھا۔ لیکن اب میں ایسا کرنے لگ گیا تھا۔ اُن دنوں اگرچہ پیشہ دارانہ طور پر میں دنیائے فلم میں سرگرم عمل نہیں تھا۔ مگر چند دیرینہ فلمی دوستوں سے میری نشست برخاست باقاعدہ قائم تھی۔ ان احباب میں محبوب، مرزا وجاہت اور جگدیش سیٹھی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اور صرف نام ہی نہیں، بلکہ ان کی تقدیر پرستی کا ذکر بھی ایک حد تک ضروری ہے۔ جگدیش سیٹھی تو خود ہی، نجومی مانے جاتے تھے۔ اور ان کا یقین اس مسئلہ میں اتنا پختہ تھا کہ کئی سال تک وہ موٹر خریدنے سے گریز کرتے رہے۔ اور یہ اس لئے کہ انھوں نے اپنی جو جنم پتری یا ہارس کوپ تیار کررکھا تھا اس

کی رو سے، اپنے پیسوں سے خریدی ہوئی کار ان کو راس نہیں آسکتی تھی۔ بلکہ ایسی کار میں وقت سے پہلے اُن کے مرجانے کا امکان بقول ان کے بھی نمایاں تھا۔ چنانچہ ایک طویل عرصہ تک انھوں نے، کار خریدنے سے پرہیز کی۔ اور جہاں تک میری دانشت کا تعلق ہے۔ ہمیشہ دوسروں کی موٹریں اور ٹیکسیاں استعمال کرتے رہے۔ محبوب اور وجاہت مرزا بھی حد درجہ تقدیر پرست تھے۔ اور جن ایام کا ذکر ہو رہا ہے ان میں ان دونوں نے ایک "نجومی" سے دوستی کر رکھی تھی۔ جس کا نام سیّد صاحب تھا۔ محبوب اور وجاہت کا کہنا تھا کہ یہ سید صاحب، اپنے فن اور علم کے لحاظ سے ایک پختہ کار اور نہایت قابلِ اعتماد انسان ہیں۔ اور ان کی بتائی ہوئی باتیں

اکثر و بیشتر درست ثابت ہوئی ہیں۔ خاص کر محبوب کے متعلق تو اس ضمن میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ شروع سے ہی تقدیر کے بہت قائل تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے سردار اختر کے ساتھ شادی بھی اسی وجہ سے کی تھی۔ محبوب کا خیال تھا کہ سردار اختر ان کے لئے، بڑی خوش بخت ثابت ہوئی ہے اور معاشقہ کے اول روز ہی سے اس خاتون نے ان کی زندگی کو ہر لحاظ سے خوش تر بنا دیا ہے۔ لیکن وجاہت کے بارے میں یہ بھی کہنا پڑے گا کہ تقدیر پرستی کے ساتھ ساتھ ایسے علوم میں ان کی دلچسپی کے اسباب کچھ اور بھی تھے۔ منتر نامے اور مکالمے کے علاوہ وجاہت کو ان دنوں اکسیر کی تلاش میں بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اور سنا تھا کہ سید صاحب اپنے علم و عمل کے ذریعہ سے

سعادت حسن منٹو۔ درد کا مارا انسان

نہ صرف انسانوں کی تقدیر ہی کے پیچ وخم دریافت کرسکتے تھے بلکہ جڑی بوٹیوں کے غیر آزمودہ اور نامعلوم اوصاف کی تہوں تک رسائی حاصل کرلینا بھی اُن کی خوبیوں میں شامل تھا چنانچہ سید صاحب کی ان مہارتوں اور بصیرتوں کے پیش نظر میں بھی کچھ عرصہ کے لئے اُن سے وابستہ ہونے لگا۔ اور اُن کی مدد سے اپنے آئندہ حالاتِ زندگی کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ چند ہی مہینوں میں اب میرا یہ حال ہوگیا کہ اگر کبھی، سید صاحب کی طرف سے اطمینان نہ ہوا، تو میں نے دوسرے جوتشیوں اور نجومیوں کے پاس پہنچنا شروع کردیا۔ اور اپنے ایک عزیز موسیقار دوست "گورگا ڈکر" کے توسط سے میں نے کئی ہندو جوتشیوں کے ساتھ رہ ورسم پیدا کر لی۔ بیکاری کے ایام تھے۔ پیسہ ٹکہ جیب میں ایک نہیں ہوتا تھا تاہم میں اور گورگا ڈکر میلوں پیدل چل چل کران مختلف جوتشیوں کے پاس پہنچ جایا کرتے تھے ان نشستوں میں جوان جوتشیوں کے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ تقدیر کے مسائل مختلف زاویوں سے زیر بحث رہا کرتے تھے۔

بہرحال میری تقدیر پرستی کا یہ سلسلہ۔ اور اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کا تجسس، سال یا ڈیڑھ سال تک بڑی شدت کے ساتھ قائم رہا۔ اس عرصہ میں، میں نے کئی جوتشیوں سے اپنی جنم پتریاں نکلوائیں۔ اور کم وبیش اتنے ہی پامسٹوں کو اپنے ہاتھوں کی ریکھائیں دکھاکر، ان سے بھی اس ضمن میں بہت کچھ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ لیکن رفتہ رفتہ اور بالآخر، ان باتوں سے میرا اعتقاد اٹھنے لگا۔ اور اس تبدیلی میں خود ان جوتشیوں اور نجومیوں کا دخل بھی بہت حد تک شامل تھا۔ جہاں تک میری جنم پتریوں کا تعلق تھا۔ میں نے یہ دیکھا کہ ایک جوتشی کی تیار کردہ جنم پتری، دوسرے کی تیار کردہ جنم پتری سے اتنی متضاد اور مختلف ہے کہ جتنے ان کے مکتبِ فکر، اور پیشہ وارانہ یا کاروباری ہتھکنڈے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ میں اب یہ سوچنے لگ گیا تھا کہ میری تقدیر اگر کوئی امرِ واقعی ہے، کوئی ناقابلِ ترمیم آئین ہے۔ تو پھر ان جوتشیوں کے تیار کردہ زائچوں میں اس کی اتنی مختلف شکلیں کیوں ہیں۔ یہ تو چلیے تسلیم کرلیا کہ

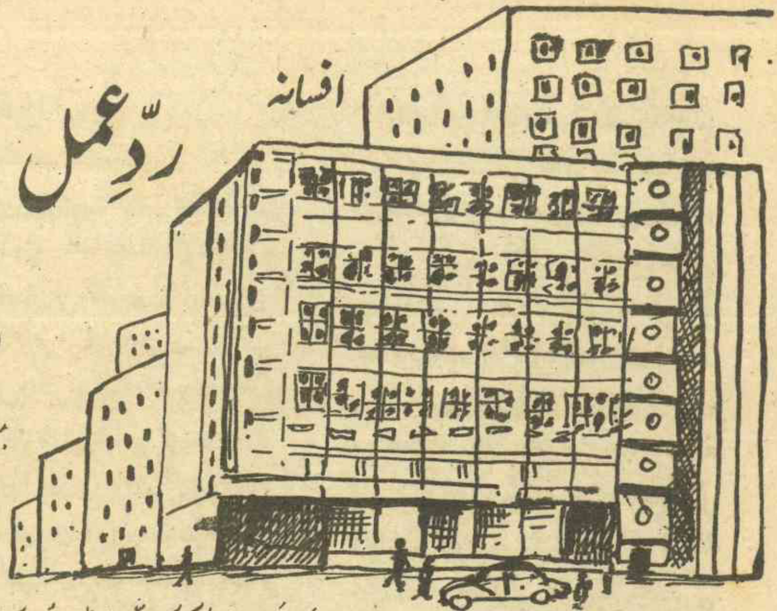
ستارے یا سیارے ایک مخصوص، اور متعینہ آئین کے تحت متحرک ہیں۔ اور اپنے دورانِ سفر میں یہ جہاں جہاں اور جن جن مقامات سے گزرتے ہیں۔ ان منازل کا علم بھی انسان کو میسر ہے۔ لیکن کسی خاص گھر میں داخل ہونے کے بعد۔ سرطان یا مشتری یا دوسرے ستارے میری زندگی، میرے فکرو نظر کی ڈگر۔ میری خوشحالی یا بدحالی کی تشکیل جو کرتے ہیں تو کیوں کرتے ہیں۔ ان دنوں میرے ذہن میں شخصی آزادی کا جو تصور تھا اس لحاظ سے بھی یہ بات کچھ کو کھلنے لگی تھی۔ اور میں سوچیا رہتا تھا کہ میری زندگی میں، جو قطعاً میری ہے۔ ان خارجی قوتوں کا دخل کیوں ہے۔ میرا بننا بگڑنا میرا نجی معاملہ ہے۔ یا بصورت دیگر اس معاشرے سے اس کا تعلق ہے۔ جس کے وجود کا میں بھی ایک حصہ ہوں۔ مگر یہ ستارے یا سیارے کس بنا پر اور کس منطق کے تحت یک طرفہ اور خودمختارانہ طور پر میری بود ونبود کے حاکم بن گئے ہیں۔ یہ اختیار ان کو کس نے دیا ہے۔ اور اگر دیا ہے تو کیوں دیا ہے؟

ادھر میں یہ بھی سوچنے لگا تھا کہ اگر تقدیر کی بالادستی کو قبول کرلیا جائے تو پھر بھی یہ کیا تک ہے کہ میں اپنے مستقبل کے حالات کو پہلے ہی سے سمجھ کر، خود کو اس لطف اندوزی سے محروم کردوں۔ جو مجھے ان کی الف لیلوی نقاب کشائی سے ملتا ہے۔ پھر چند ہی روز میں مجھ کو اس امر کا ایک نیا اور بین ثبوت بھی مل گیا۔ خلافِ توقع ایک دن فلوری نے مجھ کو یہ خبر سنادی۔ کہ وہ اپنے پرانے بوائے فرینڈ سے شادی کررہی ہے۔ اور آئندہ مجھ سے تعلقات رکھنے کی خواہاں نہیں ہے۔ لمحہ بھر کے لئے یہ ضرور محسوس ہوا کہ جیسے بڑے زور سے کسی نے میرے دل میں کیل ٹھونک دی ہے۔ اور اس کی وجہ سے میرے تمام روح وبدن میں ایک شدید درد کی لہر دوڑ گئی ہے۔ مگر بایں ہمہ یہ درد اپنی جگہ پر رہا۔ اور میری انا، اور میرا پندار محبت اپنی جگہ پر۔ اس درد کے اندھیرے اپنے ہمہ گیر پھیلاؤ کے باوجود میری انا کے چراغ کو نہ تو مدھم کرسکے، نہ ہی بجھا سکے، اور میں اس مرحلے سے بھی سربلندی اور ان تھک برجائیت کے ساتھ گزر گیا۔

راہِ حیات میں دوسرے غباروں کی طرح فلوری کا غبارہ بھی اُبھرا۔ پھیلا اور پھر رفتہ رفتہ بیٹھتا چلا گیا۔ مگر تاہم یہ اس کے جسم کی افشاں تھی اس کے حسین اور دل کش جسم کا غبار تھا۔ جہاں تک اس کی درخشندہ روح کا تعلق ہے۔ وہ انجم اب بھی، کبھی کبھی شب درد کی تاریکیوں میں دور اُفق پر جھلملیں کرتا نظر آہی جاتا ہے۔ تاہم یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ عرض بات تو یہ ہے کہ فلوری نے جو بھاری بھرکم ہتھوڑا دفعتاً میرے سر پہ ماردیا تھا۔ اس سے میں کیوں کر لطف اندوز ہوا۔ اور اگر یہی بات مجھے پہلے سے معلوم ہوچکی ہوتی تو کیا ہوتا۔ میرا خیال ہے جو بات اس ناگہانی صدمے نے میرے اندر پیدا کی تھی۔ اور اس طرح سے زندگی کا ایک پہلو جو مجھ پر منکشف ہوا تھا۔ اس کا الف لیلوی حسن اس کا دل پذیر درد، اور پھر اسی درد کی وجہ سے میرے ذہن کی تنہائیوں میں دفعتاً اور لاتعداد چراغوں کی جگمگاہٹ کا وہ نرالا آغاز، یقینی طور پر، میری افتادِ طبیعت میری ناگہانیت پسندی کے عین مطابق تھا۔ اور اسی وجہ سے میں نے اسی سے گوناگوں لطف اٹھایا۔ اور یہ بھی محسوس کیا۔ کہ جیسے اسی سے مجھے ادراک کی ایک اور منزل حاصل ہوگئی۔ بصورت دیگر میرا خیال ہے کہ میرے ذہن کی گزرگاہوں سے اس درد کا رواں یقینی طور پر کسی اور انداز سے گزرتا۔ اس کا ٹیمپو اور اس کی لَے ہی کچھ اور ہوتی۔ اور اس کی وجہ سے میرے ردعمل میں، یہ بے ساختگی، اور یہ دفعتاً فوارے کی سی پھوٹ نکلنے والی کیفیت ہرگز نہ ہوتی۔ بہرحال وہ عجیب دور تھا۔ اور زندگی طرح طرح کے روپ دھار کر سامنے آتی جارہی تھی۔ میں اگرچہ مطلقاً تقدیر پرستی سے ہنوز الگ نہیں تھا۔ مگر اس کی ظالمانہ بالادستی سے متنفر ضرور تھا۔ اسی زمانہ میں پھر میرے دائرہ احباب میں کچھ ایسے لوگ آنے لگے جن کی آمد سے، مجموعی طور پر، میرے اندازِ فکر میں غیر معمولی تبدیلیوں کے آثار رونما ہونے لگے۔ ان عظیم شخصیتوں میں سعادت حسن منٹو کی شخصیت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ منٹو ایک شعلہ صفت انسان تھا۔ جس کی تابناکی اور حدت سے متاثر ہوئے بغیر میرے خیال میں کوئی نہیں رہ سکتا تھا۔ یوں تو اس سے پیشتر میں اس سے مل بھی چکا تھا۔ اور رواروی میں چند ملاقاتیں بھی ہو چکی تھیں۔ اس کے چند افسانے بھی پڑھ رکھے تھے۔ لیکن اس کے ذہن کی مکمل ہمسائیگی مجھ کو ہنوز میسر نہیں

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمایئے





افسانہ

ردِّ عمل

مقصود ثاقب

دوپہر کو جب مہرو کمہاری شیخ صاحب کے گھر کام کاج کر کے اپنے گھر کو چلی تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے "پر" لگ جائیں اور وہ اپنے مٹی سے بنے کچے گھر میں پہنچ جائے اور پھر کاکی کے ہاتھ ایک آنے کی برف منگوا کر ٹھنڈا پانی پیئے۔

مگر گلی کا موڑ مڑتے ہی وہ "مہرو بندیئے تو لٹ گئی"، کہہ کر زمین پر ڈھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ناچتے ہوئے بگولے اس کے وجود پر کیا، اس کی ساری کائنات پر چھا گئے۔ اور وہ ڈوب ڈوب کر ابھرنے لگی۔ روتی ہوئی کاکی دھوپ میں ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی آئی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر چلانے لگی

"ہائے بے بے! ہمارا گھر ان لوگوں نے ڈھا دیا ہے ——— بے بے ان لوگوں نے مجھے دھکے بھی دیئے ہیں اور ابا کو گالیاں بھی ——— بے بے اب ہم کہاں رہیں گے؟"

مہرو کاکی کو کیا بتاتی۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ اب انہیں کہاں رہنا ہوگا۔ اس نے اردگرد کھڑے بلند و بالا مکانوں کو دیکھا اور کاکی کو اپنے آپ سے نوچتے ہوئے بولی

"نی جا مر ——— سامان کا خیال رکھ، میں ابھی ملک صاحب کے ہاں سے آتی ہوں!"

یہ سن کر کاکی کے آنسو سسکیوں میں ڈھل گئے اور وہ پلٹ پلٹ ماں کو دیکھتی کھنڈر ہوتے گھر کی طرف ہولی۔

ملک صاحب کے گھر جا کر مہرو بیگم صاحبہ کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

"بیگم صاحبہ! اس وقت میرے کاکی ہونے والی تھی جب میں نے اور کاکی کے ابا نے بوٹا سائیں کے چھپڑ سے مٹی ڈھو ڈھو کر یہ گھر بنایا تھا۔ بیگم صاحبہ! میں نے اپنے گھر کو کاکی سے بڑھ کر پیارا سمجھا۔ کاکی نے ایک بار کوئلے سے دیوار پر لکیر کھینچی تھی تو میں نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا ——— آج انہی دیواروں پر کمیٹی والے کسیاں اور بیلچے چلا رہے ہیں۔" اس کا دل ڈوبنے لگا۔

بیگم صاحبہ! بڑی اچھی طبیعت کی تھیں۔ انہوں نے اسے تسلی دی ——— "مہرو نہ رو بیٹی۔۔ نہ، میں نے تیرے آنے سے پہلے ہی اقبال کو ملک صاحب کے دفتر بھیج دیا ہے، تیرا گھر کوئی برباد نہیں کر سکتا!" اس کے دل کی مرجھائی ہوئی کلی گرتے گرتے کھل گئی۔

"بس یہیں ہاتھ روک لیں۔ ابھی چھت ہی ناس ہوئی ہے۔ ہم دوبارہ چھت ڈال لیں گے۔ سمجھ لیں گے کہ مینہ آندھی آئی اور چھت گر گئی۔"

"لیکن بیگم صاحبہ ———!" اس کی آنکھوں میں دوبارہ آنسو آ گئے ——— لیکن کاکی کے ابا کا دل کیسے سنبھلے گا۔ اس کا تو پہلے ہی "بے رحمی" والوں نے چالان کر رکھا ہے۔"

الفاظ اس کی ہچکیوں میں دبے جا رہے تھے۔

"مگر تم لوگوں نے میونسپلٹی کی جگہ میں گھر بنانے کی غلطی کیوں کی تھی؟" بیگم صاحبہ نے سوال کیا۔

مہرو نے جواب دیا ——— "دو مرلوں سے تو کمیٹی کو کچھ فرق نہیں پڑے گا، مگر ہمارے سامنے والے قاضی صاحب ہیں نا، ان کا دماغ ہمارے گدھوں کی لید پیشاب سے پھٹا جاتا تھا اس لیے انہوں نے ہماری بربادی کے لیے درخواست دی تھی۔

قدرے توقف کے بعد اس نے پوچھا ——— "بیگم صاحبہ! ایک بات بتائیے!"

"ہاں۔۔ کہو؟"

"آپ بڑے لوگوں کے دماغ اتنے نازک کیوں ہوتے ہیں؟"

بیگم صاحبہ اس کے معصومانہ سوال پر ہنس پڑیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں، اقبال اندر کمرے میں آ گیا۔

"مہرو جا تیرا گھر کوئی نہیں ڈھائے گا۔ ابا جان نے "ایس او" کو فون کر دیا ہے!"

مہرو نے بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کیا اور گھر کو آ گئی۔ سب لوگ جا چکے تھے مگر اب وہاں گھر نام کی کوئی چیز بھی موجود نہ تھی۔

ایک طرف گرد و غبار کا ڈھیر تھا جس میں سے چھت کے سرکنڈے جھانک رہے تھے دوسری طرف گھر کے سامان کا انبار پڑا تھا جس پر پھٹے پرانے کپڑے اور الجھے بالوں والی کاکی بیٹھی تھی ——— کاکی کے ہاتھ میں ایک سرکنڈا تھا جس سے وہ زمین پر لکیریں ڈال رہی تھی اور چاروں طرف کھڑے عالیشان بڑے لوگوں کے مکان خاموش کھڑے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں "آیا تھا ہمارے مقابلے میں ——— گندی مٹی کا ڈھیر!"

مہرو بیک وقت رونا اور کاکی کو پیار سے پچکارنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ یکایک سوچ میں پڑ گئی ——— گھر تو سارا ہی برباد ہو گیا ہے۔ اب وہ دوبارہ کیا بنائے گی اور کیا نہ بنائے ——— پھر وہ بھاگی بھاگی گئی اور ملبے پر بیٹھی کاکی کو اٹھا لائی اور قاضی صاحب کی بلند عمارت کے سائے میں بیٹھ کر اونچے اونچے چلانے لگی ——— "قاضی جی! آپ کو بدبو آتی

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں

تقی نایاب

حسن ناصر کا لہو جاگ رہا ہے



اگر آپ کے مطالعے کا انداز سطحی اور سرسری نہیں، بلکہ سائنسی ہے اور آپ کسی چیز کی ماہیت تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ کی نظر بہت جلد ظاہری دھند کو چیرتی ہوئی اس حقیقت تک پہنچ جائے گی، کہ ایک دنیا مرگ پذیر ہے اور ایک دنیا ظہور پذیر ہے۔ پرانی دنیا بتدریج مر رہی ہے۔ اور نئی دنیا پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن یہ تمام عمل بہ آسانی انجام نہیں پا رہا بلکہ اس کے درمیان ایک زبردست کشمکش جاری ہے، اور یہ جنگ بین الاقوامی سطح پر ہو رہی ہے۔ اسی "جنگِ عظیم" کا ایک محاذ ہمارا وطن مقدس بھی ہے، ہمارے یہاں نئی دنیا کے روح رواں مزدور کسان اور لاکھوں محنت کش عوام ہیں جبکہ اس کے برعکس مرتی ہوئی قوتوں کا مردہ جسم سرمایہ دار جاگیر دار اور نوکر شاہی پر مشتمل ہے۔

دنیا بھر کی طرح پاکستان میں بھی نئی اور پرانی، ابھرتی اور ڈوبتی ہوئی قوتوں کے درمیان زور آزمائی جاری ہے، اس سلسلہ کا ایک معرکہ آج سے ۱۲ سال قبل قلعہ لاہور میں ہوا تھا۔ جس میں ایک جانب سامراجی گماشتہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں حکمران طبقوں کا "پالتو حاکم" ایوب خان اور دوسری جانب محنت کش، مزدوروں کسانوں کی جدوجہد کا نشان حسن ناصر شہید تھا۔ دراصل یہ جنگ ایوب و ناصر کی جنگ نہ تھی۔ دو افراد کی جنگ نہ تھی، بلکہ ظالم و مظلوم کی جنگ تھی، حاکم و محکوم کی جنگ تھی۔ سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ تھی۔ جاگیردار اور کسان کی جنگ تھی۔ یہ جنگ طبقات کی جنگ تھی۔ جو اکثر وطن کی سرحدوں میں لڑی جاتی ہے۔ وطن کی سرزمین پر لڑی جانیوالی اس لڑائی میں ایوب خاں کا ظلم بڑھتا رہا۔ حسن ناصر کا عزم بلند ہوتا رہا اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایوب خاں اپنے ظلم کی جلائی ہوئی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا اور حسن ناصر کا لہو بہر نکلا جس میں طاقت بھی تھی توانائی بھی۔

۱۹۶۰ء میں جب سرمایہ دارانہ جبر اپنی تمام تر قوجی وحشتناکیوں کے ساتھ عروج پر تھا۔ ظلم و بربریت کا دورہ تھا، انقلابی سیاست کے میدانِ عمل میں ہر جانب سناٹا تھا اور طبقاتی جنگ کے کئی نام نہاد قائد اپنی بزدلی کو "احتیاط" کا نام دے کر بلوں میں گھس گئے تھے تو اس کڑے وقت میں حسن ناصر نے اپنے نوجوان عزم و حوصلے سے اس سکوت کو توڑا اور انقلابی سیاست کے میدان کو پھر اپنی جواں ہمتی سے سرسبز کر دیا۔ اور بزدل انقلابیوں کو بتایا کہ عوام کے لئے انقلابی کام جاری رکھتے ہوئے اپنے آپ کو حتی الامکان محفوظ رکھنا "احتیاط" ہے، لیکن انقلابی کام سے پہلو تہی کرنا "بزدلی" ہے۔ خود حسن ناصر جن راہوں پر جا رہا تھا وہ خوب جانتا تھا کہ یہ راہیں زنداں سے ہو کر گزرتی ہیں اور مقتل کو جاتی ہیں۔ حسن ناصر ان راہوں پر ثابت قدمی سے بڑھتا رہا۔ زنداں کی صعوبتیں برداشت اور مقتل میں خون دیکر اپنے لہو سے ایک مشعل روشن کر دی جس نے انقلابی راستے کی پیچیدگی کو دور کر دیا کہ منزل انقلاب تک پہنچنے کے لئے ہمیں کئی بار کوئے یار سے سوئے دار کا سفر طے کرنا ہے۔

پھر طالب علم بھائیوں نے حسن ناصر کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بہادرانہ لڑائی لڑی اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ داؤد کاٹن ملز، گل احمد ٹیکسٹائل ملز، لانڈھی کورنگی ولیکا ملز اور سائٹ کے گمنام شہیدوں نے لہو دیا۔ صوبہ سرحد کے کسانوں نے اپنا خون دیکر ان راہوں کو ہموار کیا۔ جن سے حسن ناصر گزرا تھا، اس لئے آج جب ہم حسن ناصر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں تو ان تمام شہیدوں کی عظمت کو سلام کرتے ہیں کیونکہ وہ تمام لوگ عمل میں حسن ناصر تھے۔ حسن ناصر کا خون انقلاب کے لئے بہا تو ان کا لہو بھی اسی کام آیا جو حسن ناصر کی منزل تھی وہی ان کا مطمع نظر۔ جس میدان میں حسن ناصر شہید ہوا، ان کے جسم بھی اسی میدانِ جنگ سے سلامت اٹھائے گئے تھے۔ ناصر ہی کی طرح انھوں نے اپنے لہو کی تال کو چے گویرا، لیکس فیوچک، نگوین وان تروئے پیٹرک لوممبا کے لہو کی تال سے ملا کر عوامی جنگ کی فتح کے ترانے کی قوت محرکہ بنا دیا۔ صبح کے وہ تمام متوالے حسن ناصر ہی کی طرح اس شب کی تیرگی سے برسرِ پیکار تھے۔ انھوں نے اپنے لہو کی سرخی سے مستقبل میں طلوع ہونیوالے سورج میں اضافہ کیا۔

اس لئے حسن ناصر تمام شہیدوں کی علامت بن چکا ہے، عوامی جدوجہد اور تحریک کی علامت حسن ناصر کے خون کو طبقاتی جنگ کے شہدا کے جس لہو کو سرمایہ داروں نے قلعہ لاہور میں چھپانا چاہا، آج اس خون کی ہر بوند ہتھیلی پر چراغ لئے جگہ جگہ موجود ہے۔ حسن ناصر کا خون جگہ جگہ سر اٹھا رہا ہے۔ حسن ناصر کا خون آج شمالی ہشت نگر میں "کھیت وڈیروں سے لے لو" کا نعرہ بن کر اٹھا اور ٹھوس عملی صورت اختیار کر گیا۔ لانڈھی کورنگی، سائٹ اور کوہ نور ریان ملز میں، "ملیں لٹیروں سے لے لو" کا نعرہ بن گیا اور فکر و عمل کی ہم آہنگی کا لازوال کرشمہ بن گیا — اسی لئے آج حسن ناصر کراچی کے صنعتی علاقہ سے لے کر سرحد بلوچستان پنجاب اور سندھ کے کھیتوں میں ہر جگہ موجود ہے حسن ناصر زندہ ہے، حسن ناصر کا لہو جاگ رہا ہے۔

تصحیح

قارئین کرام الفتح کے گذشتہ شمارے "حسن ناصر نمبر" میں منہاج برنا صاحب کے مضمون میں کتابت کی مندرجہ ذیل غلطیوں کی تصحیح کرلیں۔

صفحہ ۵ کے پہلے کالم کے آخری پیراگراف میں "مسلم انقلاب" کی بجائے "مسلح انقلاب" پڑھا جائے۔

صفحہ ۵ کے دوسرے کالم کے پہلے پیراگراف "بھیگتے ہیں" کی بجائے "بیٹھتے ہیں" پڑھا جائے۔ صفحہ ۵ کے تیسرے کالم کی اولین سطور میں "تحریکوں" کی بجائے "کجرویوں" پڑھا جائے۔

(ایڈیٹر)

خدا جانے نصاب کی کتابیں کب چھپتی اور کہاں بکتی ہیں؟

احتشام نذیر فاروقی

آج کل "جنریشن گیپ" کی اصطلاح اکثر سننے میں آتی ہے۔ یہ کس کی ایجاد ہے اور کیونکر ایجاد ہوئی اس کا تو ہمیں علم نہیں۔ بہرحال اس سے مراد یہ ہے کہ نئی نسل اور اس سے پچھلی نسل کے درمیان میں ایک خلا پایا جاتا ہے دونوں نسلوں کے خیالات اور رجحانات میں تضاد ہے ٹکراؤ ہے۔ لیکن خیالات کے اس تصادم کے اسباب کیا ہیں؟ وہ کونسی وجوہات ہیں جن کی بناء پر نئی نسل اپنے بزرگوں سے اختلافات رکھتی ہے؟

انسانی نفسیات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ انسان کے ذہن پر اس کے دور کے حالات بڑے گہرے نقوش چھوڑتے ہیں اور انسان خود ان حالات کو پیدا کرنے میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ گزشتہ پچاس برس میں مغربی دنیا میں جو زبردست سائنسی ترقی ہوئی ہے اس کے اثرات دنیا کے دوسرے حصوں میں بسنے والے افراد پر بھی پڑے ہیں اور خاص طور پر نوجوان بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اس تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں ہر قوم کے لیے ایک اچھا تعلیمی نظام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

یہ دور نئی نسل کا دور ہے۔ آج کے نوجوانوں کی اکثریت اپنے وقت کی ہر بات کو چاہے وہ ٹھیک ہو یا غلط، درست ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے حالانکہ تاریخ بتاتی ہے کہ ہر زمانے میں صحیح اور غلط روایات پائی جاتی ہیں۔ کسی بھی دور کو مکمل طور پر اچھی یا بری روایات اور اقدار کا دور نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن آج کی نئی نسل اپنے زمانے کی تمام مادی، اخلاقی اور ذہنی تبدیلیوں کو درست قرار دیتی ہے۔ آج کا نوجوان صحیح اور غلط کے درمیان کوئی واضح خط نہیں کھینچ سکتا۔ لیکن ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہمارا نصاب طالب علموں کو وہ راستہ نہیں دکھاتا، جس پر چل کر وہ اپنی دشواریوں کو دور کرسکیں اور ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔ تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ چند کتابیں رٹا دی جائیں اور اس میں سے امتحان لے لیا جائے۔ ہمارے یہاں اچھے نمبر اس کو ملتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ کتاب کے الفاظ لکھ آتا ہے۔

درحقیقت تعلیم کے معنی ہیں، ذہنوں کو تربیت دینا ایک فرد کو اس قابل بنانا کہ وہ کچھ سمجھنے اور سمجھانے کے قابل ہوسکے۔ تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ ایک فرد اس قابل ہوجائے کہ اپنے ماحول کی خامیوں کو تلاش کرکے ختم کرسکے اور اس طرح نہ صرف اپنی ذات کو بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی ایک بہتر زندگی گزارنے کا حق دلوا سکے

ہمارا آج کا نوجوان ہر مسئلے پر اپنے بزرگوں سے اختلاف کرتا ہے اور کبھی کبھی تو ذہنی کشمکش اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اختلاف کی تمام حدوں کو توڑ دیتا ہے اور یہ سب کچھ بزرگوں کی ناراضگی کا باعث ہوتا ہے۔ دراصل اس ذہنی الجھن کو جنم دینے والی ہماری تعلیم ہے نئی نسل کے مصائب کا ذمہ دار ہمارا موجودہ نصاب ہے نئی نسل حقائق کو تسلیم کرنے میں اس لیے ناکام رہتی ہے کہ اس کو وہ سب کچھ نہیں ملتا کہ جس کی بناء پر اس کا ذہن روشن ہوسکے۔

ہمیں اپنے تعلیمی نصاب کو بدل کر بہتر بنانا ہوگا اس لیے کہ کتابیں ایک طالب علم کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہیں۔ ایک نوجوان جب بارہ یا چودہ سال کی مدت گزارنے کے بعد اپنی درس گاہ سے باہر آتا ہے تو اس کے دماغ میں وہی کچھ ہوتا ہے۔ جو اس نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہوتا ہے مگر جب وہ دنیا کو کچھ اور ہی پاتا ہے تو حیران پریشان رہ جاتا ہے۔ جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے اور ایسے کرداروں سے ملتا ہے جو ان کرداروں سے مختلف ہوتے ہیں جن سے وہ کتابوں میں متعارف ہوا تھا تو وہ دنگ رہ جاتا ہے اور پھر ہزاروں مسائل سر اٹھاتے ہیں۔

سیاست، معیشت اور اخلاق ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ہر زمانے کا ادب اپنے حالات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بات ضروری ہے کہ نصاب مرتب کرتے وقت جدید ادب کا خیال رکھا جائے اور اسے زیادہ جگہ دی جائے تاکہ طالب علم اپنے وقت کے تقاضوں کو سمجھنے میں آسانی محسوس کرے، نصاب اس انداز کا ہونا چاہیے کہ طالب علم زندگی کی حقیقتوں سے روشناس ہوسکے۔ عظیم لینن نے کہا تھا — "زندگی اور سیاست سے باہر اسکول ایک جھوٹ اور فریب ہے —!"

ہمارے یہاں اردو اور انگریزی دونوں میڈیم چلتے ہیں لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں میں ہی کتابوں کی زبردست کمی ہے۔ جب انگریزی میڈیم والے کوئی کتاب خریدنے جاتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ "یہ کتاب ابھی نہیں آئی!" اور جب کوئی اردو کی کتاب کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ چھپ رہی ہے۔ خدا جانے کتابیں کب چھپتی ہیں۔ اور کب بازار میں آتی ہیں۔

کتابوں کی دکانوں پر اصل کتابیں کم اور کتابوں کی شرحیں زیادہ ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ حل شدہ پرچوں سے بھی کام چلتا ہے۔ کتابوں کے نام صرف سلیبس میں لکھے جانے کے لیے ہوتے ہیں۔ جہاں تک پڑھنے کا تعلق ہے اس کے لیے کچھ اور ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں طالب علموں کے خیالات کس طرح نکھر سکتے ہیں۔ تعلیم کے معیار کو بڑھانے کے لیے ان مسائل کا حل بے حد ضروری ہے۔ ورنہ یہ نئی نسل ابھی اور برباد ہوگی اور لفظ ترقی اس نئی نسل کے لیے بے معنی ہوکر رہ جائے گا۔



محنت کشوں کے روز و شب

دس ماہ کی مختصر مدت میں

10 ہزار مزدور بے روزگار کر دیئے گئے

احسان عظیم

موجودہ حکومت نے اپنے دس ماہ کے مختصر عرصے میں مختلف طبقات کے شہریوں پر متعدد بار گولیاں چلائی ہیں۔ گولیوں کا شکار ہونے والوں میں مزدور، کسان اور متوسط طبقے کے شہریوں کے علاوہ قیدی بھی شامل ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اب تک مجموعی طور پر ایک سو سے زائد افراد شہید اور ایک ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے ہیں۔ یہ تعداد ایوب آمریت کے بارہ سالہ ظلم و تشدد سے کہیں زیادہ ہے۔

سندھ میں منگھوپیر، لانڈھی، کورنگی، گھارو، دھابیجی، کوٹری، حیدرآباد اور سکھر بڑے صنعتی علاقے ہیں۔ یہاں صوبے کی مجموعی بالغ آبادی کا تقریباً تیس فیصد یعنی پچیس لاکھ کے لگ بھگ افراد براہِ راست نجی صنعتوں سے وابستہ بطورِ مزدور کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے دو تہائی سے زائد مزدور صرف کراچی میں کام کرتے ہیں۔ اگر ان میں نیم سرکاری خود مختار اور صوبائی اور مرکزی حکومت کے ملازمین کو بھی شامل کر لیا جائے تو مزدوروں کی مجموعی تعداد تقریباً چالیس لاکھ یا نصف کروڑ کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح سندھ میں مزدوروں کی حیثیت دیگر طبقات کے مقابلے میں خصوصی نوعیت کی حامل ہے۔

موجودہ حکمران جماعت نے انتخابی سرگرمیوں کے دوران ان مزدوروں کو روزگار کی ضمانت کے ذریعے معقول اُجرت، جس میں روٹی۔ کپڑا۔ مکان۔ علاج اور تعلیم کی ضروریات کو پورا کرنے کا اعلان کیا تھا۔ جس کی بناء پر مزدوروں کی واضح اکثریت نے ہر جگہ انتخاب میں ہارون، ولیکا اور فیلنسی جیسے سرمایہ داروں اور ان کے ایجنٹوں کے مقابلے میں ستار گبول، اور حنیف جیسے غیر معروف افراد کو منتخب کر کے پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا۔ انتخابی نتیجہ سے برہم ہو کر سرمایہ داروں نے ۱۹۷۰ اور ۱۹۷۱ء کے دو سالوں کے درمیان دس ہزار سے زیادہ مزدوروں کو بے روزگار اور سینکڑوں کارکنوں کو مقدمات میں ملوث کر کے جیلوں میں بند کرایا۔ اقتدار منتقل ہونے تک پیپلز پارٹی کے قائدین یہ کہہ کر مزدوروں کو مطمئن کرتے رہے کہ اقتدار میں آنے بعد سب ٹھیک کر دیں گے۔ اقتدار میں آنے کے بعد حکومت نے جو حکم جاری کیا اس میں ۱۹۷۱ء میں برطرف کئے گئے صرف ایسے مزدوروں کو جنھوں نے حساب نہیں لیا تھا ملازمت پر بحال کرنے کا حکم جاری کیا لیکن اس حکم کی بھی قانونی حیثیت نہیں تھی۔ چنانچہ بیشتر مالکان نے حکم پر عمل نہیں کیا۔ مزدوروں کے شدید مطالبے پر جب مارشل لاء کا ضابطہ نافذ ہوا تو عبوری دستور کا اعلان کر دیا گیا۔ جس میں مارشل لاء کے اس ضابطے کو تحفظ نہیں دیا اور عملاً دو سالوں کے درمیان پیپلز پارٹی کی حمایت کے جرم میں برطرف کئے جانے والے مزدور بحال نہ ہو سکے۔

موجودہ حکومت کے دس ماہ کے مختصر عرصے میں سندھ کے اندر تالہ بندی، جزوی تالہ بندی، خام مال کی عدم فراہمی، لے آف اور انتقامی کارروائیوں کے ذریعے سے دس ہزار کے لگ بھگ مزدور بے روزگار ہو گئے۔ صرف کراچی میں ۷۰ سے زائد فیکٹریاں مکمل طور پر بند ہیں سو سے زائد فیکٹریوں میں جزوی تالہ بندی اور تخفیف کے ذریعے چھ ہزار سے زائد مزدوروں کو بے روزگار کر دیا گیا ہے۔ بند ہونے والی چند فیکٹریوں میں غفور ٹیکسٹائل ملز۔ لاکھانی سلک۔ شاہد ٹیکسٹائل موٹکس فونڈری۔ ایس۔ این اینڈ انڈسٹریز۔ اورینٹ سلک ملز۔ اعکومے فیبر ہوزری۔ سجاد سلک۔ کراؤن سلک۔ اولمپک ہوزری۔ سٹیل کارپوریشن۔ فائن ٹاولز ٹیکمری ٹاولز۔ غنی اینڈ کمپنی۔ منور ملز۔ پاک پین۔ عابد انڈسٹریز غنی ٹیکسٹائل۔ میجر انڈسٹریز۔ کراچی انڈسٹریز کارپوریشن۔ دادا سلک۔ لمٹن دادا یلا سلک۔ لکی سلک کرم علی ٹیکسٹائل۔ فرسیکو انڈسٹریز۔ فالکو انٹرنیشنل، سلیمان سلک۔ تاج الدین سلک۔ ایم اے فٹ ویئر۔ یونیورسل ڈائننگ۔ اسٹینڈرڈ مائیز۔ ڈیکور انٹرنیشنل، پنجاب پائپ۔ فنل فائن فیبرکس۔ وائی ایم انڈسٹریز اسٹار سلک۔ جاپان ٹیکسٹائل۔ موتی آئل۔ پاکستان انٹرنیشنل۔ ایس۔ این۔ ایچ انڈسٹریز۔ ایگل ٹیکسٹائل جی این آر انڈسٹریز۔ ویلیفس ٹیکسٹائل۔ پیراماؤنٹ

دوسو سے زائد کارخانے جزوی یا کلی طور پر بند کر دیئے گئے

انڈسٹریز بیوریج۔ بنارس ساڑی۔ آفتاب فلور اسٹار انڈسٹریز۔ جی۔ ایم۔ آر سلک۔ رومن انڈسٹریز اروما انڈسٹریز۔ عالم انڈسٹریز۔ الفاروق کانٹی نینٹل ٹوئیل فرحت سلک۔ تاج مبین۔ پاکستان انڈسٹریل کارپوریشن ایس کے انڈسٹریز۔ جان لیس وغیرہ وغیرہ مکمل طور پر بند کر دی گئیں جبکہ مانڈی والا موٹرس۔ آدم سلک باوانی انڈسٹریز۔ ایچ ایم سلک آنس ٹیکسٹائل۔ ایور شائن پینٹ۔ طالب انڈسٹریز۔ پرنٹرس کمبائن۔ الائیڈ ریان۔ امین وڈ۔ شاب سلک۔ زیبا ٹیکسٹائل زیب تن ٹیکسٹائل، جزوی طور پر بند کی گئیں۔

کراچی کے علاوہ کوٹری میں امین فیبرکس۔ اٹلس ٹیکسٹائل۔ اور نیٹ اسٹرا بورڈ وغیرہ میں جزوی تخفیف کے ذریعے پیداوار میں کمی اور مزدوروں کو بے روزگار کیا گیا۔ حیدر آباد میں فتح ٹیکسٹائل ملز میں نصف یعنی آٹھ سو سے زائد مزدوروں کو دباؤ کے ذریعے ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ نشاط کیمیکل انڈسٹریز کوٹری اور دیگر فیکٹریوں میں مہینوں سے لے آف کا سلسلہ شروع ہے۔

پیداوار میں بنیادی طور پر تین فریق شامل ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی کمی پیداوار کو متاثر کرتی ہے یہ فریق مشین، مزدور اور خام مال کی فراہمی پر مشتمل ہیں مشین اس کے لوانمات اور خام مال کی فراہمی بنیادی طور پر مالکان اور منتظمین فیکٹری پر ہے۔ مشرقی پاکستان پر بھارتی توسیع پسندوں کا قبضہ، غیر ملکی قرضوں اور امداد کے عدم حصول، سکے کی قیمت میں کمی اور بیرونی منڈی نہ ہونے کے بہانے صنعت کاروں، منتظمین اور سرمایہ داروں نے تقریباً دو سو سے زائد کارخانے کلی یا جزوی طور پر بند کر کے ایک چوتھائی پیداوار کم کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ بیشتر کارخانوں میں معقول اور بہتر معیار کا اور حسب ضرورت خام مال فراہم نہیں کیا جا رہا ہے۔ مثلاً سندھ ٹیکسٹائل، اور نیٹ اسٹرا بورڈ کوٹری، میں ایک عرصے تک حسب ضرورت معیاری خام مال فراہم نہیں کیا گیا۔ اسی طرح لانڈھی کی متنازعہ فیکٹریوں مثلاً گل احمد وغیرہ میں خام مال مطلوبہ مقدار اور معیاری فراہم نہیں گیا نتیجے کے طور پر پیداوار اور مزدوروں کی مزدوری میں کمی ہو گئی۔

فیکٹری بند کرنے، تالہ بندی، تخفیف اور خام مال کی مطلوبہ مقدار میں عدم فراہمی کے ذریعہ پیداوار میں کمی اور مزدوروں کی بے چینی بڑھانے اور بیروزگار کرنے میں مالکان کے تین مقاصد ہیں۔ اول موجودہ حکومت کی عائد کردہ پابندیوں مثلاً مینجنگ ایجنسیز کا توڑا جانا کو غیر مؤثر بنانا ٹیکس بچانا اور سوئم، غیر یقینی حالات کے پیشِ نظر بتدریج سرمایہ نکالنا

مزدور حلقوں خصوصاً متحدہ مزدور فیڈریشن نے پیداوار میں کمی کے سلسلے میں مالکان کی سازشوں کو محسوس کرتے ہوئے وزیر محنت سندھ عبدالستار گبول کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ پیداوار کی کمی کا جائزہ لینے کے لئے ماہرین پر مشتمل ایک سہ فریقی کمیشن یا کمیٹی مقرر کی جائے جس میں حکام کے علاوہ مزدوروں اور مالکان کے نمائندے بھی شامل کئے جائیں۔ لیکن تجویز سے اتفاق کرنے کے باوجود آج تک، کمیٹی تشکیل نہیں کی گئی۔ اس طرح دانستہ طور پر حقائق کو منظرِ عام پر لانے سے گریز کیا گیا۔ فیکٹریوں میں تالہ بندی خام مال کی عدم فراہمی یا کمی کے نتیجہ میں پیداوار کی کمی کا الزام مزدوروں کے سر تھوپنا، دیانت پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بڑھتی ہوئی بیروزگاری کے علاوہ مالکان کی جانب سے مزدور قوانین کی خلاف، انحراف کے ذریعے معمولی سے مراعات اور سہولیات سے بھی مزدوروں کو محروم رکھنا مزدوروں کی بے چینی کی دوسری بڑی وجہ ہے۔ مثلاً فیکٹری ایکٹ ۱۹۳۴ء کے تحت آٹھ گھنٹے یومیہ کام کے اوقات اور زائد گھنٹے کیلئے دوگنی شرح سے معاوضہ کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بیشتر چھوٹی فیکٹریاں روزانہ آٹھ گھنٹے کی بجائے دس اور بارہ گھنٹے خدمات لیتی ہیں اکثر زائد وقت کا معاوضہ قانون کے مطابق دوگنی شرح کے بجائے سنگل ادائیگی کرتی ہیں۔ چنارہ انڈسٹریز کوٹری جیسی فیکٹریوں میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ محکمہ لیبر کے ریکارڈ میں مزدوروں کی شکایت اور اکثر چالانوں سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اسٹینڈنگ آرڈر میں ترمیم کے ذریعے گروپ انشورنس لازمی کیا گیا ہے لیکن

کارخانے داروں کی اکثریت نے چھ ماہ سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود اس قانون پر عمل نہیں کیا۔ مثلاً کوٹری کے ستاون ۵۷ کارخانوں میں سے تقریباً تیس کارخانوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن اب تک مزدوروں کے شدید احتجاج کے بعد صرف دس فیکٹریوں میں گروپ انشورنس کے تحت بیمہ کرایا گیا ہے۔ پے منٹ آف ویجز ایکٹ، شاپس اینڈ اسٹیبلشمنٹ آرڈی ننس، ویلفیئر آرڈی ننس وغیرہ کی خلاف ورزی روز کا معمول ہے۔ متعلقہ حکام عموماً فیکٹری کے معائنے اور قانون پر عملدرآمد کی ذمہ داری پوری نہیں کرتے۔

صنعتی تنازعات میں مداخلت اور تصفیہ کی ذمہ داری بنیادی طور پر محکمۂ محنت کے سر ہے۔ لیکن محکمۂ محنت کو عضو معطل بنا کر رکھ دیا گیا ہے صنعتی تنازعات کا تصفیہ بجائے محکمہ محنت کا انتظامی افسران اور پولیس کے ذریعے کرایا جا رہا ہے۔ محکمہ پولیس اور شہری حکام مالکان کی رپورٹ پر بغیر کسی تحقیقات اور ہر مسئلہ کو امن و امان کا مسئلہ قرار دے کر اور دباؤ کے ذریعے بے چینی پیدا کرنے کا باعث بنے ہوتے ہیں۔ کارکنوں کی گرفتاری اور کارخانوں میں پولیس کا پہرہ روز کا معمول ہے۔ کراچی کے سینکڑوں کارکنوں کے علاوہ کوٹری جیسی چھوٹی جگہ تقریباً ہر فیکٹری کے کارکن، مالکان کی رپورٹ پر ہر روز گرفتاریوں کا تجربہ کر رہے ہیں۔ مثلاً سینیٹوز جامشورو۔ سندھ ٹیکسٹائل ملز۔ کوہنٹہ ٹیکسٹائل ملز۔ غلام حسین ہدایت اللہ۔ امین فیبرکس وغیرہ میں گزشتہ دو ماہ کے دوران کی گئی گرفتاریاں کھلی مثالیں ہیں۔ پھر بھی الزام ہے کہ مزدور معقولیت کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

موجودہ حکومت نے مزدوروں کی تنخواہ بڑھانے سے تو یہ کہہ کر انکار کیا کہ اس سے افراطِ زر بڑھے گا اور اس کے بجائے سہولیات میں اضافے کا وعدہ کیا کا غذ پر ہر مزدور کے ایک بچے کی میٹرک تک تعلیم کے اخراجات کا وعدہ کیا گیا۔ لیکن قانون میں شرط یہ رکھی گئی کہ اس قانون کا صرف ایسے کارخانوں پر نفاذ کیا جائے گا جو بیس لاکھ کے ادا شدہ سرمایہ سے تین سال سے زیادہ عرصے سے چلایا جا رہا ہو۔ چالیس لاکھ کا اثاثہ بن چکا ہو، اور ایک شفٹ میں سو سے زائد مزدور کام کرتے ہوں! اس طرح عملاً تعلیم کی مفت مراعات، محدود کر دی گئی ہیں۔ مثلاً کوٹری صنعتی علاقے کے ستاون ۵۷ کارخانوں میں صرف

گروپ انشورنس کی اسکیم پر عمل نہیں کیا جا رہا ہے

چھ کارخانوں پر اس قانون کا نفاذ ہو سکتا ہے۔ لیکن سندھ کی صوبائی حکومت نے چھ ماہ سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد بھی قواعد نہ بنا کر مزدوروں کو اس معمولی مراعات سے بھی محروم رکھا ہے۔ اس طرح بڑھاپہ پنشن کے قواعد بھی اب تک نہیں بنائے گئے۔

ایوب حکومت نے مزدوروں کے مطالبہ پر مہنگائی کا دباؤ کم کرنے کے لئے فیئر پرائس شاپ کھولنے کا قانون بنایا تھا۔ چند کارخانوں میں محدود پیمانے پر عمل بھی شروع ہوا۔ لیکن موجودہ حکومت کے دور میں فیئر پرائس شاپ کو مزید وسعت دینے کے بجائے سرے سے عمل در آمد معطل ہو گیا ہے۔ حالت یہ ہے کہ گذشتہ دس ماہ کے دوران آٹا بیس روپے سے بڑھ کر انتیس روپے تک پہنچ گیا ہے۔ اور اسی طرح دیگر اشیاء صرف بھی گراں تر ہو گئی ہیں۔ لیکن مہنگائی کے انسداد کے لئے حکومت نے اعلانات کے علاوہ اب تک کچھ نہیں کیا ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی مزدوروں کی بے چینی کا ایک انتہائی ٹھوس سبب ہے۔

مالکان نے ایک عرصہ سے یہ طریقہ اپنایا ہوا ہے کہ مزدوروں کے دباؤ پر بعض مطالبات تسلیم کرتے ہوئے معاہدہ کر لیتے ہیں، لیکن ان معاہدوں پر عملدر آمد نہیں کرتے۔ گذشتہ دس ماہ کے دوران بیشتر صنعتی تنازعات کی معاہدات سے انحراف یا خلاف ورزی رہی ہے۔ مثلاً مئی ۱۹۷۲ء میں کوٹری کے عام ہڑتال اور یونائیٹڈ اسٹارلبورڈ کے مالکان کی معاہدہ سے انحراف کی بنا پر ہوئی۔ یا ۷ جون ۱۹۷۲ء فیروز سلطان ملز پر پولیس فائرنگ اور نتیجہ میں عام ہڑتال حیدرآباد میں، فتح ٹیکسٹائل کے مالکان کی معاہدہ سے انحراف اور لانڈھی کی حالیہ صورت حال کی بنیاد بھی مشین ٹول فیکٹری کے مالکان کی معاہدہ سے انحراف ہے۔

مزدوروں کی ہر بڑی جدوجہد کے موقع پر مالکان منتظمین اور حکومت کی جانب سے مزدوروں پر تخریب پسندی، ملک دشمنی اور غیر ملکی سازش کا مسلسل الزام لگایا جانا فیشن بنا ہوا ہے۔ لیکن کیا مالکان اور حکومت کے ذمہ دار اس مسئلے پر بھی اظہار خیال کریں گے، کہ مزدوروں کی بڑے پیمانے پر چھانٹی، تالہ بندی اور بر طرفی کے ذریعے بیروزگاری پیداوار میں کمی کی وجہ نہیں ہے۔ اور ان کی نگاہ میں یہ فعل ملک دوستی ہے یا ملک دشمنی؟ اور کیا دس ماہ کے مختصر عرصے میں دو سو کے قریب کارخانوں کو بند یا نیم بند کرنے سے پیداوار میں کمی نہیں واقع ہوئی ہے۔ اور کیا کارخانہ بند کرنا ملک دوستی ہے؟ اور کیا مالکان کی جانب سے مزدور قوانین اور معاہدات سے انحراف اور خلاف ورزی ملک دوستی ہے؟ اور کیا مزدور قوانین پر عملدرآمد کی نگرانی کے لئے قواعد نہ بنانا اور عوام کے ٹیکسوں کے لاکھوں روپے کے خرچ سے محکمہ محنت کے مصالحتی شعبہ کو بے کار رکھنا اور شہری انتظامیہ کے ذریعے صنعتی تنازعات کا حل تلاش کرنا خود اپنے وعدوں پر عمل نہ کرنا ملک دوستی اور فرض شناسی ہے؟

سندھ کے وزیر اعلیٰ جناب ممتاز علی بھٹو نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ حکومت مزدوروں کے سامنے "دست بستہ" پیش ہوتی آئی ہے۔ لیکن "مزدور دشمنی کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ گزشتہ دس ماہ کے واقعات موصوف کے اس جملے کے مقابلہ میں متضاد رخ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً سندھ کی حکومت نے دس ماہ کے طویل عرصے میں ٹریڈ یونینوں کے نمائندوں کیساتھ مسائل سمجھنے کے لئے کسی کانفرنس کی ضرورت نہیں سمجھی ملکی بنیاد پر سہ فریقی لیبر کانفرنس کے بعد صدر بھٹو نے اعلان کیا تھا کہ صوبائی سطح پر اس طرح کی کانفرنس ہر تین ماہ کے بعد بلائی جاتی رہے گی۔ تاکہ مسائل سامنے آسکیں۔ لیکن آج تک کوئی کانفرنس طلب نہیں کی گئی۔ گذشتہ دس ماہ کے دوران خود وزیر اعلیٰ وزیر محنت یا کسی دیگر وزیر نے مزدوروں سے رابطہ اور علاقوں میں جا کر موقع پر حالات جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

مئی ۱۹۷۲ء میں کوٹری کے مزدوروں پر شہری انتظامیہ کی قطعی ناجائز فائرنگ لاٹھی چارج اور گرفتاریوں کے سلسلے میں وزیر محنت گبول نے ۷ مئی ۷۲ء کو سرکٹ ہاؤس حیدرآباد اور پھر ۱۷ مئی ۷۲ء کو خود وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ پر ان کی جانب سے مزدوروں کی رہائی، اور مقدمات کے خاتمہ کا اعلان کیا۔ لیکن پانچ ماہ سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود وعدہ کو پورا نہیں کیا گیا۔ ۷ جون کی فائرنگ اور بارہ روزہ ہڑتال کے خاتمہ کے لئے حکومت سندھ نے اعلان کیا کہ ۷ جون ۱۹۷۲ء کے بعد گرفتار مزدوروں کو فوری طور پر رہائی اور اس سے پیشتر کے گرفتار مزدوروں کے مقدمات کا جائزہ لینے کے لئے مزدور نمائندوں پر مشتمل چار رکنی کمیٹی بنائی جائے گی۔ لیکن اس اعلان پر بھی مکمل طور پر عمل نہیں کیا گیا۔ گزشتہ دس ماہ کے دوران صرف مزدوروں پر پانچ مرتبہ سے زائد فائرنگ، چالیس کے قریب مزدوروں کو شہید، سندھ بھر میں ایک ہزار سے زائد مزدوروں کو مختلف الزامات کے تحت گرفتاریاں "دست بستہ" پیش ہونیکی علامت ہے!!

مزدوروں پر یہ بھی الزام ہے کہ وہ تصادم کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ اس الزام کی صحت بھی ملاحظہ فرمائیں۔ کوٹری میں اور یونائیٹڈ اسٹارلبورڈ کے مالکان نے جنوری ۱۹۷۲ء کے معاہدہ پر عمل نہیں کیا۔ احتجاج پر فروری ۷۲ء میں مزدوروں کو تنخواہ ادا نہیں کی۔ مزدوروں کے احتجاج پر فروری ۷۲ء میں مارچ کے پہلے ہفتے میں مالکان فیکٹری سے غائب ہو گئے۔ ان کی عدم موجودگی کے باوجود مزدوروں نے خام مال ختم ہونے تک نہ صرف پیداوار جاری رکھی بلکہ عام دنوں کے مقابلے میں دوگنی کے قریب پیداوار دی۔ تین ماہ تک مالکان غیر حاضر رہے۔ مزدوروں کو تنخواہ ادا نہیں کی۔ مزدوروں نے تنخواہ کی ادائیگی معاہدے پر عمل اور حالات کو معمول پر لانے کے لئے محکمہ محنت شہری انتظامیہ حکومت وغیرہ سب کا دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن نتیجہ صفر رہا۔ مالکان کی ہٹ دھرمی اور حکام کی غفلت سے مجبور ہو کر جب علاقے کے مزدوروں نے احتجاجی ہڑتال کی تو شہری انتظامیہ نے بغیر کسی معقول جواز کے مزدوروں پر فائرنگ، گرفتاری اور لاٹھی چارج کے ذریعے تشدد کیا۔

فتح ٹیکسٹائل ملز حیدرآباد کے مالکان نے جزوی معاہدے سے انحراف کے لئے فیکٹری سے غیر حاضر ہو گئے۔ غنڈوں کے ذریعے مزدوروں میں فساد برپا کرنے کی سازش کی بڑی مقدار میں آتشیں اسلحہ کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی موجودگی میں مزدوروں پر حملہ آور ہوئے اور خود پولیس حکام پر بھی فائرنگ کی۔ غنڈوں اور فیکٹری مالکان کی گرفتاری کے ساتھ ساتھ شہری انتظامیہ نے فیکٹری تین یوم کے لئے بند کرنے کے نام پر تین ماہ بند رکھ کر

مزدوروں کو معاشی مشکل میں مبتلا کیا۔ مزدوروں کے احتجاج پر عہدیداروں کو گرفتار کیا گیا۔ اور پھر آٹھ سو مزدوروں کو دباؤ کے ذریعے بے روزگار کیا گیا۔

جون ۱۹۷۲ء میں فیروز سلطان انڈسٹریز میں معاہدہ کے مطابق منافع کا ڈھائی فیصد ادا نہیں کیا گیا۔ مزدوروں کے احتجاج پر لے آف کر کے بے روزگار کرنے کی سازش کی گئی۔ مزدوروں کے مزید احتجاج پر پولیس نے کسی جواز اور قانونی حکم کے بغیر گولی چلا کر شعیب اور دیگر مزدوروں کو شہید اور زخمی کیا۔ ۸ جون کو بنارس کالونی سے شعیب شہید کے جنازہ پر ناجائز فائرنگ کے ذریعے درجنوں مزدوروں کو شہید کیا گیا۔ گڈو بیراج میں تعمیراتی ٹھیکیدار کمپنی مزدوروں کو جائز سہولیات سے محروم کئے ہوئے تھی۔ مزدوروں کے احتجاج پر پولیس نے مزدوروں پر بے رحمی کے ساتھ تشدد کیا۔ سینکڑوں مزدوروں کو گرفتار کیا گیا۔

لانڈھی کے مزدوروں کی ہڑتال کے سلسلہ میں ۱۸ اکتوبر ۷۲ء کو صوبائی وزیر محنت نے اپنے دفتر پر دس بجے دن میں مزدور نمائندوں کے ساتھ مذاکرات کا وقت مقرر کیا۔ دوسری طرف شہری انتظامیہ نے صبح چھ بجے باقاعدہ منصوبہ کے ساتھ پولیس ایکشن کر کے مزدوروں کو شہید اور زخمی کیا۔ دوسرے دن مزدوروں کے جلسے پر پولیس کی بڑی جمعیت کے ساتھ حملہ کر کے کئی مزدوروں کو شہید اور زخمی کیا گیا۔ متحدہ مزدور فیڈریشن کے صدر عثمان بلوچ اور فیڈریشن سے وابستہ یونینوں کے متعدد عہدیداروں کو ناجائز اور غیر ضروری طور پر گرفتار کر کے اشتعال انگیزی کی گئی۔ مزدوروں کے خلاف مذکورہ اقدامات "دست بستہ" ہونے کی خوب تر مثال ہے۔ اگر واقعی مزدور تصادم چاہتے تو ان کے حملے کا نشانہ یقیناً مدِ مقابل ہوتے۔ لیکن آج تک ایک بھی ایسی مثال پیش نہیں کی جا سکتی کہ مزدور حکام یا دفاتر پر حملہ آور ہوئے ہوں شہری حکام یا منتظمین ہلاک یا زخمی ہوئے ہوں آخر مزدوروں کی جانب سے تصادم کی کیسی کوشش ہے۔ جس میں خود ہی ہلاک اور زخمی ہوتے ہیں مزدوروں پر یہ بھی الزام لگایا گیا ہے کہ ان سے آتشیں اسلحہ اور میزائل دستیاب کرتے، اور میزائل کے استعمال کی مثال سامنے رکھی گئی ہے۔ پولیس کے گھیرے میں تلاشی کے بعد موقع پر اسلحہ اور میزائل کہاں غائب ہو گیا...؟

گذشتہ ۲۵ سال سے عوام کی ہر قسم کی جدوجہد اور تنقید کو ملک دشمنی، غداری، غیر ملکی سازش اور تخریب پسندی کا نام دے کر مسائل کو نظر انداز اور تشدد کے ذریعے دبانے کے فلسفہ پر عمل کیا گیا ہے۔ حکمران گروہوں کے اس طریقہ کار کے نتیجہ میں ملک کا نصف حصہ دشمن کے قبضہ میں معاشی ابتری سیاسی انتشار اور قومی وقار، عزت اور ناموس کو مجروح کیا گیا ہے۔ مسائل نظر انداز کرنے یا تشدد کے ذریعے دبانے سے ختم نہیں ہوتے بلکہ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ماضی کے تجربات کے پیش نظر اس رویہ کو تبدیل کیا جانا چاہیے۔ مزدوروں اور عوام کی جدوجہد کو تشدد کے ذریعے وقتی طور پر دبایا تو جا سکتا ہے۔ لیکن ختم نہیں کیا جا سکتا۔ وقت کا تقاضا ہے کہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا جائے اور مزدوروں کے ساتھ مذاکرات اور سیاسی اقدامات کے ذریعے مسائل حل کئے جائیں۔

بقیہ: سرورق کی کہانی

فیصلہ ایک ترقی پسند استحصال سے پاک معاشرے کے حق میں دے دیا ہے۔ امریکی وزارت خارجہ کے فیصلہ کی گھن گرج پاکستان نے بھی محسوس کر لیا ہے کہ ایشیائی عوام کے ساتھ دائمی دوستی ایشیائی عوام کی امنگوں کا ساتھ دینے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

سیٹو سے علیحدگی ایک ایسے معاہدے سے علیحدگی ہے جس نے گذشتہ دو دہائیوں سے پاکستان کے عوام کو ان کے اپنے بر اعظم کے عظیم عوام سے علیحدہ کر رکھا تھا اور ہر چند کہ وہ کھل کر ان معاہدوں کے خلاف آ چکے تھے، لیکن سرکاری سطح پر ان کی کوئی نمائندگی نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر آنے والی تبدیلیوں نے پاکستان کے عوام کی یکاسکی لاج رکھی ہے۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی میں یہ ایک نمایاں اور بڑی مثبت تبدیلی ہے۔ اس تبدیلی کی بنا پر پاکستان کے عوام میں جنھوں نے تحریر اور تقریر کے ذریعہ ان معاہدوں کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ہر موقع پر کیا ——

پاکستان کے عوام نے پیپلز پارٹی کو اس لئے بھی ووٹ دیا تھا کہ جناب بھٹو نے ایک متحرک فعال اور ترقی پسند خارجہ پالیسی تشکیل دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ہمیں اس بات کا اب اعتراف کر لینا چاہیئے کہ صرف وہی ممالک اپنی خارجہ پالیسی میں دوسروں کے اشارے پر چلتے ہیں، جن کے عوام اپنے نصب العین سے ہٹ جائیں اور متحرک خارجی حقائق سے منہ موڑ لیں۔ ویت نام کے عوام نے جنوب مشرقی ایشیا کے عوام کو زندہ رہنے اور سامراج سے مقابلہ کرنے کا ایسا سبق سکھا دیا ہے کہ ہم اس پر عمل کر کے اپنی آزادی ہمیشہ برقرار رکھ سکتے ہیں۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی میں نئے رجحانات کی طرف ابھی ایسے اقدامات باقی ہیں جن پر پاکستان کو فوری طور پر قدم اٹھانا ہوگا۔ کیونکہ ایسے ہی طریقہ کار سے ہم بڑی طاقتوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ میں غیر جانبدار ہو سکتے ہیں۔ اب جبکہ پاکستان کی حکومت نے شمالی ویت نام اور شمالی کوریا کو تسلیم کر لیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ویت نام کی انقلابی حکومت کو بھی تسلیم کر لیں جس کے تحت قومی آزادی کی تحریک جاری ہے۔ یہ انقلابی حکومت، ویت نام کی عبوری حکومت کی حیثیت سے مشہور ہے۔ یہ ویت نام کے حریت پسند عوام کی نمائندہ حکومت ہے، جس کو دنیا کی تمام ترقی پسند حکومتوں نے تسلیم کر لیا ہے۔ حقیقت میں شمالی ویت نام اور ویت نام کی عبوری حکومت ویت نام کے عوام کی امنگوں کی حقیقی آئینہ دار ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ پاکستان کی حکومت کو پرنس سہانوک کی جلا وطن حکومت کو بھی تسلیم کر لینا چاہیئے جو در اصل کمبوڈیا کے جدوجہد آزادی میں مصروف عوام کی حکومت ہے۔ اس سلسلہ میں پاکستانیوں کو ایک بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جب جنوری ۱۹۷۲ء میں صدر بھٹو چین گئے تھے تو اس وقت پرنس سہانوک نے جوشیلے انداز میں پاکستان کے مؤقف کی حمایت کرتے ہوئے ہندوستانی جارحیت اور روسی سوشل سامراج کی ریشہ دوانیوں کی —— مذمت کی تھی۔ پرنس سہانوک نے جس بے باک انداز میں پاکستان کے مؤقف کی حمایت کی ہے، پاکستان کے عوام اس کے شکر گزار ہیں۔ اور ہم پاکستان کی حکومت سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ پرنس سہانوک کی جلا وطن حکومت کو تسلیم کر کے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے حقیقی خدوخال کو حقیقی امنگوں سے ہمکنار کرے گی۔

ہمیں یہ امید ہے کہ پاکستان کی حکومت آج کے حالات کے سامنے، جو امریکہ کی ویت نام سے پسپائی سے پیدا ہوئے ہیں، اپنے مؤقف کو عوامی امنگوں سے سجائے گا تاکہ ایک مضبوط پاکستان کا تصور ہمارے سامنے آئے نا کہ سفارتی سطح پر، جہاں نوکر شاہی اپنے طبقاتی مفادات میں اندھی ہو کر پاکستان کو برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

لاہور

مرزا محمد ابراہیم اور میجر اسحاق محمد کا مشترکہ بیان

”عوام کی پارٹیوں“ نے عوام پر عذاب کے دروازے کھول دیئے

سرحد میں مزدوروں، مزارعین، کھیت مزدوروں، ٹیچروں اور طالب علموں پر فائرنگ، آنسو گیس کا استعمال اور لاٹھی چارج روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔ ہشت نگر آج عالمی انقلابی تحریک کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ بلوچستان میں جھل جھاؤ اور فاران کے کسانوں کا خون بہایا گیا۔ اور وہاں بھی طالب علموں اور نوجوانوں پر تشدد کا دور دورہ ہے۔ کسان کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ پنجاب میں ہر جگہ مزدوروں پر بے پناہ تشدد استعمال کیا گیا۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے کارخانوں کے مزدوروں کو خاص طور پر درندگی کا نشانہ بنایا گیا ہے، ان کے خلاف جاگیرداروں، قمار خانوں اور شراب خانوں کے غنڈوں کا باقاعدہ استعمال کیا گیا ہے۔ حال ہی میں ٹیچروں پر بے محابا تشدد برتا گیا — پیپلز پارٹی کے ارباب اقتدار نے یہاں اپنا طبقاتی بھائی چارہ پھر سے قائم کر لیا ہے۔ اور پیپلز پارٹی کے مخالف جاگیرداروں کو پیپلز پارٹی میں شامل کر کے پارٹی کے ووٹر کسانوں پر عذاب کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں۔

کوہ نور ریان ملز کا لاشاہ کاکو کے جیالے مزدوروں پر حالیہ تشدد نے پیپلز پارٹی کی مزدور دوستی کے دعوؤں کی قلعی کھول دی ہے۔ یہ وہ کارخانہ ہے جہاں کے مزدوروں نے صنعت کو سرکاری تحویل میں لینے کی پالیسی کو حقیقی معنوں میں کامیاب ثابت کیا اور صنعت کاروں کے ملکی معیشت میں بے بدل ہونے کے پروپیگنڈے کو باطل کر دیا ہے۔ پیداوار کو بڑھا کر اور خرید و فروخت اور حساب و کتاب کی دھاندلیوں کو مفلوج کر کے منافع کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ اور اس طرح قومی معیشت کو بحال کرنے اور قوم کو موجودہ بحران سے نکالنے میں گراں قدر کارکردگی دکھائی ہے۔ لیکن اس سے خوش ہونے کی بجائے حکمران طبقے کے اوسان خطا ہو گئے۔ انہوں نے کوہ نور ریان ملز کے مزدوروں کی کارکردگی کو جو قوم کے لئے روشنی کا معیار ہے، اپنے لئے موت کا شگون قرار دیا اور یہاں بھی غنڈہ گردی کو اپنا شعار بنا لیا۔ مزدوروں نے احتجاج کیا تو ٹریڈ یونین کے سرکردہ رہنماؤں کو فرضی مقدمات میں ملوث کر کے بند کر دیا گیا۔ مزدوروں نے تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود ایک منٹ کے لئے بھی ملز کو بند نہیں کیا۔ اور نہ ہی حکومت اور ملز انتظامیہ کے تشدد کا جواب تشدد سے دیا۔ یہاں لاقانونیت، تشدد اور دھاندلی کا سہرا کس کے سر ہے، وہ صاف ظاہر ہے۔ یقیناً باقی مقامات پر بھی مزدوروں کی یہی پالیسی ہے۔ لیکن مزدوروں پر بے بنیاد الزامات لگائے جاتے رہے ہیں۔

صوبہ سندھ کے محنت کشوں پر تشدد کی انتہا ہو گئی ہے۔ نہتے محنت کشوں پر فائرنگ، اموات اور زخمیوں کی تعداد عوامی اقتدار کے دس مہینوں میں ایوب شاہی اور یحییٰ شاہی کے ۱۳ سالوں سے بھی بڑھ گئی ہے۔ علامات سے نظر آ رہا ہے کہ ہنوز روز اول ہے۔ چنانچہ ایک طرف کھلی منافقت کے ساتھ ”مہذب“ ملکوں کی روایات کا واسطہ دیا جا رہا ہے اور دوسری طرف مزدوروں کو ہڑتال کے حق سے محروم کرنے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ مزدور بستیوں پر ڈپٹی کمشنر کی کمان میں پولیس اور ملیشیا اس طرح دھاوا بول رہی ہیں گویا یہ دشمن کی قلعہ بندیاں ہوں۔

محنت کشوں پر براہِ راست یلغار کے علاوہ ان کے حامی سیاسی عناصر کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ مختار رانا اور محنت کشوں کے دوسرے حامیوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ آثار ایسے نظر آ رہے ہیں کہ ملک بھر میں محنت کشوں اور ان کے حامیوں کے خلاف ایک عام یلغار کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اور یہ سب اس لئے ہو رہا ہے، تاکہ صنعت کاروں کی بے محابا لوٹ کو جس کا نام منافع رکھا گیا ہے، تحفظ دیا جا سکے۔ حکمران طبقوں کے سرپرستوں یعنی امریکہ، جرمنی، برطانیہ اور جاپان اور دوسرے سامراجی ممالک کو مزید سرمایہ کاری کی ترغیب دی جا سکے۔ اور بائیس خاندانوں میں نئے خاندان کا اضافہ کیا جا سکے۔ اس ضمن میں عالمی بنک کے اعلیٰ اختیارات کے مشن کا ملک میں غیر معمولی عرصے سے قیام معنی خیز ہے۔ پنجاب کے عوام گڑ شکر کو ترس رہے تھے تو اس کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اب جبکہ کسانوں نے گڑ بنانا شروع کر دیا ہے اور اس کا بھاؤ معمول پر آ گیا ہے تو اس کی برآمد پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ تاکہ شوگر ملوں کو سستا گنا مل سکے۔ اس طرح جب تک کپاس تاجروں کے گوداموں میں تھی اس پر برآمدی ڈیوٹی معمولی تھی، اب جب کپاس کسانوں کی جھولیوں میں آئی ہے تو اس پر برآمدی ڈیوٹی بڑھا دی گئی تاکہ کپڑے کی ملوں کو سستی کپاس مل سکے۔ کسانوں سے جبری غلہ لے کر سمگلروں کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ اور اس طرح شہروں کے صارفین کی مہنگائی جوں کی توں رہتی ہے۔ سمگلنگ پھر سے بزنس کا درجہ پا رہی ہے۔ سامراجی کھاد کے کارخانوں کی سہولت کے لئے کھاد کی قیمتیں بڑھا دی گئی ہیں۔ اور ٹرانسپورٹروں کے منافع میں اضافہ کرنے کے لئے کرائے بڑھا دیئے گئے ہیں۔

مہنگائی میں اضافہ کو روکنے کی بجائے مزدوروں، ٹیچروں، کلرکوں اور دوسرے مقررہ آمدنی والے ملازمین سے یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ تنخواہوں میں اضافہ کا مطالبہ نہ کریں۔ مزدوروں سے ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ نہ لینے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن گورنروں اور وزراء اعلیٰ کے لئے چند دنوں کی نوکری کے عوض تمام عمر گراں قدر مشاہروں اور دوسری رعایتوں کا اعلان کیا جاتا ہے۔ ٹیچروں کے تنخواہوں میں اضافے کے مطالبہ پر معماران قوم اساتذہ کے خلاف بھی آنسو گیس اور لاٹھیاں گردش میں آ جاتی ہیں۔ لیکن امیر زادوں کے تعلیمی اداروں کے لئے گراں قدر رقمیں دی جاتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ پیپلز پارٹی، نیپ اور جمعیت العلمائے اسلام کی حکومتوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے، جو محنت کشوں کے ووٹوں کے سہارے اقتدار میں آئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پارٹیاں اپنے ان انتخابی منشوروں سے بھی منحرف ہو گئی ہیں جن کی بناو

پران کو اقتدار ملا ہے۔ ہم ان کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی بے راہ روی سے باز آجائیں۔ مزدوروں، کسانوں اور دوسرے محنت کشوں پر تشدد اور دھاندلی کی پالیسی ترک کر دیں۔ اب تک جو زیادتیاں اُن سے سرزد ہوئی ہیں ان کا مداوا کریں ورنہ ان کا حشر وہی ہوگا جو تاریخ میں ہر ظالم کا ہوا ہے۔

ہم تمام محنت کشوں اور ان کے نمائندوں سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ وقت کی نزاکت کو سمجھیں۔ اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر آپس میں اتحاد پیدا کریں اور مل کر ظلم و ستم، سامراج اور سرمایہ داری، جاگیرداری اور افسر شاہی غلبے اور آمریت کی دیوار کو ایک دھکا اور لگانے کی تیاری کریں۔

پشاور

مفتی محمود سرحد کو "مثالی" صوبہ بنا رہے ہیں

عبدالوحید اعوان

وزارتِ عالیہ کی مسند پر بیٹھتے ہی ملا مفتی محمود نے بعض اہم علانات کئے۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ وہ صوبے میں اسلامی قوانین کا نفاذ کرتے ہوئے اسے مثالی صوبہ بنا دیں گے۔ اور اب ہر فرد کسی ہچکچاہٹ کے بغیر لوٹ مار، دہشت و قتل و غارت گری اور کسانوں۔ طالب علموں۔ اور مزدوروں پر ظلم کے لحاظ سے اس صوبہ کو "مثالی" کہنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ امن و امان کی حالت بالکل بگڑ چکی ہے۔ اس پر تعجب یہ ہے کہ حکومت "سب اچھا ہے" کی رٹ لگائے جا رہی ہے۔ وزیر اعلیٰ سے لے کر نوکر شاہی کے پرزوں تک "پرسکون صورتِ حال" کا راگ الاپ رہے ہیں۔ بقول ان کے یہ سچ ہے کیونکہ سرکٹ ہاؤس اور نوکر شاہی کے مسکن جہاں ہر وقت مسلح پولیس کے پہرے لگے ہوتے ہیں، محفوظ ہیں۔ ان کے مکینوں کے لئے غیر تسلی بخش صورتِ حال طلبہ، کسانوں اور مزدوروں کی صدائے احتجاج ہوتی ہے۔ جب یہ ان کی تحریک کو لاقانونیت، شر پسندی اور غنڈہ گردی سے تعبیر کر کے دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ موجودہ حالات میں بھی غنڈوں اور لٹیروں کو کھلم کھلا لوٹ مار کی اجازت سے ڈاکہ زنی کی وارداتیں عام ہو رہی ہیں۔ دن دہاڑے بندوق کی نالی دکھا کر کسی کو اغوا کرنا معمولی بات ہے۔ دھمکی آمیز خطوط کا موصول ہونا عام سی چیز ہے۔ اور اب نوبت گلی کوچہ میں بیٹھنے والے دکانداروں کو لوٹنے تک پہنچ گئی ہے۔ صوبائی حکومت نے ہر ایرے غیرے کو اسلحہ لائسنس دے کر مفتی کے چمچوں اور پختون زلمے کو مسلح کر دیا ہے۔ نہ جانے کس لئے؟

اس کے برعکس اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے والوں پر ہر روز لاٹھیاں برستی ہیں۔ سوات کے لوے کلی میں ایف سی کے سپاہیوں نے لڑکیوں کو چھیڑا۔ انہیں منع کیا گیا — تو ہاتھا پائی ہوئی۔ ایک سپاہی ایف سی کے تین ٹرک لے آیا جنہوں نے گاؤں والوں پر فائرنگ کی جس سے شمس الرحمان شہید ہو گیا۔ جب سرحد کے طلبہ نے سوات میں شہید ہونے والے شمس الرحمان کے قاتلوں کو سزا دینے کے لئے صدائے احتجاج بلند کی تو حکومت نے طلبہ کی آواز کو دبانے کے لئے اُن پر بار بار لاٹھی چارج کیا۔ اور اُن کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ لیکن طلبہ برادری کی صفوں میں مکمل اتحاد ہے اور وہ ایک مضبوط دیوار کی صورت میں اپنے مؤقف پر قائم ہیں۔

مزدوروں کے ساتھ بھی بدتر سلوک روا رکھا گیا ہے۔ حکومت کی سرمایہ داروں کی پشت پناہی سے ظاہر ہے کہ جب کوہاٹ ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں نے اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کی تو ان کی لیبر یونین کے صدر دلدار خان کو گرفتار کر لیا گیا۔ جس کے خلاف ملز کے مزدوروں نے گورنر ہاؤس کے سامنے مظاہرہ کیا۔ اس موقع پر یونین کے نائب صدر محمد اسحاق نے کہا کہ مل کی انتظامیہ کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی رو سے مل میں کام ہونا تھا اور انتظامیہ نے مزدوروں کی جگہ جن لوگوں کو بھرتی کیا تھا ان کو گرفتار کیا جانا چاہیئے تھا لیکن اس کی بجائے یونین کے صدر دلدار خان کو گرفتار کر لیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ دلدار خان کو رہا کیا جائے۔ ان کے مطالبات تسلیم کئے جائیں۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو وہ اپنے حقوق کے حصول کے لئے اسلام آباد جائیں گے کیونکہ صوبائی حکومت مبینہ طور پر ملز مالکان سے ملی ہوئی ہے۔

وزارتِ خارجہ کی وضاحت

مکرمی مدیر صاحب!

میں آپ کی توجہ آپ کے مؤقر جریدہ کی اشاعت ۱۲ تا ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء کے "احوالِ واقعی" کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ جس میں آپ نے یوم انقلاب چین کی تقریبات میں پاکستانی وفد کی عدم شرکت کی وجہ پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

آپ نے اس سلسلے میں پاکستان کی عدم شرکت کی جو وجہ بتائی ہے، اس کا حقیقت حال سے قطعی طور پر کوئی تعلق نہیں۔ حقیقت حال صرف اس قدر ہے کہ یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء کے بعد سے عوامی جمہوریہ چین میں کوئی بھی قومی دن روائتی تقریباتی انداز میں نہیں منایا جا رہا۔ اور اس ضمن میں تھوڑی بہت تقریبات ہوتی ہیں، ان میں بھی باہر کے کسی ملک کو شرکت کی دعوت نہیں دی جاتی۔

اس سال بھی یوم انقلاب کی تقریبات میں بھی دوسرے ملکوں کی طرح پاکستان کو کوئی دعوت نامہ موصول نہیں ہوا۔ دعوت کی غیر موجودگی میں پاکستان کے کسی وفد کے عوامی جمہوریہ چین بھیجے جانے کا یا اس مقصد کے لئے پاکستانی وفد کی ترتیب و تشکیل یا قیادت پر کسی قسم کے اختلاف رائے کے سامنے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح "احوال واقعی" میں کہی گئیں باتیں حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔

میں نے چند گزارشات اصل حقائق واضح کرنے کے لئے تجویز کر دی ہیں تاکہ آپ کے قارئین بھی ان سے آگاہ ہو سکیں۔

(فقط - آپ کا عبدالحیٔ قریشی)

افسر اطلاعات متعلقہ وزارتِ خارجہ۔ اسلام آباد۔

قارئین کہتے ہیں



پشاور میں ٹریفک کی بے قاعدگیاں

یہ پشاور کا بازار کریم پورہ ہے۔ وقت صبح دس بجے کا ہے۔ اور یہاں گالیوں اور ناشائستہ کلمات کا فیاضانہ استعمال ہو رہا ہے۔ کس کے درمیان؟ جھگڑا کرنیوالے دونوں فریق تانگے چلاتے ہیں۔ ایک تانگہ صحیح سمت سے آ رہا تھا۔ اور دوسرا تانگہ مخالف سمت سے۔ مخالف سمت سے آنے والے تانگے کا اصرار ہے کہ وہ درست کہہ رہا ہے اور دوسری طرف سے آنے والے تانگے کا کہنا ہے کہ قانونی طور پر وہ صحیح کہتا ہے۔ اور مخالف طرف سے آنے والے نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔ بات طول پکڑ گئی۔ دونوں تانگے والے گالیوں کے بعد ہاتھا پائی پر اتر آئے۔ راہ گیر جن میں عورتیں اور بوڑھے بھی شامل ہیں اس انتظار میں ہیں کہ جھگڑا ختم ہو تو وہ اپنی منزل کی طرف بڑھیں۔ کیونکہ بازار تنگ ہے اور دو تانگوں کی آمنے سامنے موجودگی سے راہ گیروں کے لئے راہ نکلنا ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔

یہ تاریخی چوک، چوک یادگار ہے۔ گزرے دنوں کی بات ہے، یہاں ٹریفک کا نظام بہت عمدہ تھا۔ ٹریفک کا سپاہی سارا دن اپنے فرائض ایمانداری سے انجام دیتا تھا۔ مگر اب حالت یہ ہے کہ یہاں ٹریفک کی بے قاعدگیاں بام عروج پر پہنچ چکی ہیں، ٹریفک کا سپاہی دور دور تک نظر نہیں آتا۔ رکشے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، تانگے غیر قانونی سمت اختیار کرتے ہیں۔ اور دوسری گاڑیوں کا تو حوا نہیں۔

قصہ خوانی بازار کو آیئے، یہ تاریخی بازار چوک یادگار کی طرح ریڑھیوں کا گڑھ بنتا جا رہا ہے۔ ہتھ ریڑھیوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ کیا اجازت دینے والے حکام کو اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ ہتھ ریڑھیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے ٹریفک کی راہ میں کیا کیا مشکلات پیدا ہی ہیں۔ قصہ خوانی کے فٹ پاتھ پرانے کوٹ بیچنے والوں سے پٹے پڑے ہیں۔ عوام کیا کریں۔ سڑک پر چلنے سے حادثے کا احتمال رہتا ہے۔ عجیب مضحکہ خیز صورت ہے۔

ان باتوں سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ پشاور میں ٹریفک کی حالت کتنی ناگفتہ بہ ہو چکی ہے۔ اور عوام کو اس مسئلے نے کتنا پریشان اور مضطرب کر دیا ہے۔ لیکن آفرین ہے ٹریفک حکام پر جنھوں نے اس مسئلے کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے

ایک اور سڑک جس کا تذکرہ ضروری ہے' گورنمنٹ کالج پشاور کو جانے والی سڑک ہے۔ اس سے نہ صرف کالج کے طلبہ بلکہ راہ گیر بھی شدت سے نالاں ہیں۔ یہ سڑک ناپختہ ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی گاؤں یا قصبہ کی سڑک ہے۔ اس سڑک پر ٹریفک کا کوئی سپاہی نہیں۔ سڑک پر جگہ جگہ مٹی کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں۔ جو کسی بھی گاڑی کے گزرنے کے بعد عجیب کمال دکھاتے ہیں۔ اور ڈھیروں من مٹی اچھال کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ طالب علم اور راہ گیر جو سڑک کے کنارے کھڑے ہوتے ہیں یا کالج کو آ رہے ہوتے ہیں ان کے کوٹوں کے گوشے گوشے میں مٹی اپنا ڈیرہ جما لیتی ہے۔ اور چہرہ گرد آلود ہو جاتا ہے۔

اس ضمن میں چند تجاویز پیش ہیں۔

۱۔ ٹریفک یک طرفہ قرار دی جائے۔ اور جو گاڑی خلاف ورزی کرے کم از کم چھ ماہ کے لئے اس کا لائسنس منسوخ کر دیا جائے۔

۲۔ چوک یادگار اور قصہ خوانی میں ہتھ ریڑھیوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے۔

۳۔ گورنمنٹ کالج پشاور کو جانے والی سڑک پختہ کر دی جائے۔

ان تجاویز پر عمل کرنے ہی سے ٹریفک کی مشکلات ختم ہو سکتی ہیں۔ ورنہ مسئلہ اور بگڑ جائے گا۔ اور ذمہ داری سراسر حکام ہی کے سر ہو گی۔

مہدی حسن - پشاور

بقیہ: سندھ کی بٹائی تحریک

صفحہ ۱۲ سے آگے

سندھ سر غلام حسین ہدایت اللہ کو پورا ریکارڈ دکھایا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد ہمارے وارنٹ واپس لے لیے گئے۔ پاکستان بننے کے ایک سال بعد بٹائی تحریک ختم ہو گئی۔ کیونکہ اس تحریک نے کسانوں میں اتنا شعور پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے زور پر اپنا حصہ حاصل کر سکتے تھے۔"

رئیس بروہی خاموش ہو گئے تو میں نے ان سے سوال کیا ——— "سائیں آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ بالاچ بروہی کس طرح شہید ہوئے؟"

"گیجانی کا مہذو زمیندار' بالاچ بروہی سے بہت جلتا تھا۔ کیونکہ اس کے اناج کو بزور کسانوں میں تقسیم کرایا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں جبکہ بالاچ بروہی نوابشاہ سے واپس آ رہے تھے اور جنگل سے اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے تو اس کے غنڈوں نے کلہاڑیوں سے پے در پے وار کر کے انہیں شہید کر دیا۔"

"سائیں! اب کچھ اپنی زندگی کے حالات بھی بتا دیں!" شبّر اعظمی نے ان سے کہا۔

رئیس بروہی کے بوڑھے چہرے پر ماضی کی تلخ یادوں کا عکس جھلملانے لگا۔

"میرے والد مبین بروہی کے پاس تھوڑی سی زمین تھی جسے انہوں نے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنی زندگی ہی میں بیچ دیا تھا۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ چنانچہ ابھی میں نے آنکھ کھولی ہی تھی کہ مجھے محنت مشقت پر لگا دیا گیا۔ بعد میں میں نے زمینداروں سے کچھ زمین لے کر اس پر کھیتی باڑی کا کام شروع کر دیا۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ پھر یہاں قرب وجوار میں کوئی اسکول بھی نہیں تھا' والد کے تھوڑے بہت مویشی تھے انھیں چرایا کرتا تھا۔ سات سال کا تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ شروع میں کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جب میں نے ایک ہندو زمیندار دیوان لیشن داس کے پاس کمدار کی حیثیت سے کام شروع کیا تو اس کے خیالات سے بہت متاثر تھا۔ لیشن داس روشن خیال کانگریسی تھا اسے کسانوں کی حالت پر بہت ترس آتا تھا۔ اس نے مجھے

اس بات کی اجازت دیدی کہ میں ہاریوں میں جاکر کام کروں۔ اس دوران کچھ ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جنھوں نے مجھے بتایا کہ دنیا کے دوسرے ممالک میں مزدور اور کسان کس طرح جدوجہد کے ذریعے اپنے حالات بدل رہے ہیں۔ اس طرح دھیرے دھیرے سب کچھ میری سمجھ میں آگیا، کہ کس طرح چند استحصالی ملکران محنت کشوں کو لوٹتے ہیں، جو پیداوار کے خالق ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں ہاری کمیٹی میں شامل ہوگیا۔ دراصل میرا ایک کام سے شہدادپور گیا ہوا تھا۔ وہاں ہاریوں کا ایک جلسہ ہو رہا تھا، میں بھی جاکر کھڑا ہوگیا۔ دیکھوں، کیا ہو رہا ہے، وہاں میری ملاقات ڈاکٹر آشارام سے ہوئی۔ انھوں نے مجھے ہاری کمیٹی کا پروگرام بتایا اور مجھ سے پوچھا، تم کیا کرتے ہو۔ میں نے کہا، میں کمداری کرتا ہوں۔ لیکن میں کمداری چھوڑ کر ہاریوں میں پوری طرح کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں نواب شاہ گیا اور وہاں ہاری کمیٹی کا دوآنے کا رکن بن گیا۔ مجھے ایک رسید بک بھی دی گئی کہ اپنے دوستوں کو بھی ہاری کمیٹی کا رکن بناؤ۔ چنانچہ میں نے باضابطہ طور پر ہاری کمیٹی کے کام شروع کر دیا۔"

"پہلے کے مقابلے میں اب ہاریوں کے حالات کیسے ہیں؟" میں نے آخری سوال کیا۔

"پہلے کے مقابلے میں ہاری اب زیادہ بیدار ہیں۔" رئیس بروہی کا چہرہ جوش سے تمتمانے لگا۔ پہلے میرے رشتہ دار تک مجھ سے بیزار رہتے تھے کہ میں خواہ مخواہ، زمینداروں کی دشمنی مول لے رہا ہوں۔ لیکن اب دور دور سے لوگ مشورہ کرنے آتے ہیں۔ انھیں اس بات کا احساس ہوگیا ہے کہ "زمین اس کی ہے، جو اس پر ہل چلاتا ہے"۔ موجودہ حکومت اپنے پاؤں پر کلہاڑی چلا رہی ہے۔ ظلم اسی طرح ہو رہا ہے۔ ہاری آج بھی اپنے حقوق سے محروم ہیں۔ لیکن پہلے وہ خاموش رہتے تھے، آج ان کی آواز کوئی طاقت نہیں دبا سکتی۔ بے دخلیاں پہلے سے بھی وسیع پیمانے پر ہو رہی ہیں۔ ایوب کی اصلاحات کی طرح بھٹو کی اصلاحات کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ زمینداروں نے اپنی زمینیں پہلے ہی اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور بنائے ہوئے رشتہ داروں میں تقسیم کر دی ہیں۔ پرانے کپڑے پر پیوند لگانے سے کام نہیں چلے گا۔ ہاری کو اسکے حقوق جدوجہد کے ذریعے حاصل ہوں گے، خیرات میں نہیں ملیں گے۔ جب تک اقتدار پر ان کا قبضہ نہیں ہوگا اور یہ نظام نہیں بدلے گا، وہ یونہی بدحال رہیں گے۔"

رات کے دو بج چکے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ رئیس بروہی سے رات بھر باتیں کرتے رہیں۔ ہمیں صبح سویرے شہدادپور کے لئے روانہ ہونا تھا۔ پھر ہمیں یہ احساس بھی تھا کہ ہماری طرح رئیس بروہی بھی تھک چکے ہوں گے۔ اس لئے ہم نے انکا زیادہ وقت لینا مناسب نہیں سمجھا۔

صبح ناشتے کے بعد رئیس بروہی ہمیں بس اسٹاپ تک چھوڑنے آئے جو میرآچن سے دو میل دور ہے۔ کھیتوں میں جگہ جگہ عورتیں کپاس چن رہی تھیں۔ ایک جگہ سفید بیلوں کی ایک جوڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اور کسی زمیندار کا ہاری دور ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھا سستا رہا تھا۔ آسمان روشن تھا۔ دھرتی سے زندگی کے نغمے پھوٹ رہے تھے۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ زندگی کا تمام حسن کسانوں کی تخلیق ہے، پھر وہ روشنی سے محروم کیوں رہتا ہے؟!

بقیہ : ضیاء سرحدی کی یادداشتیں

ہوئی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کچھ اور لوگوں کی طرح میں بھی اس وقت تک منٹو کو ہیجان پسند۔ اور ایک محض جذبات انگیز قسم کا مصنف گردانتا تھا۔ لیکن جب مجھ کو اس کے قرب کا شرف حاصل ہوا تو بہت سے پردے اٹھ گئے۔ اور ان کے پیچھے سے، ایک دکھ کا مارا انسان ایک نکتہ بیں انسان، ایک واجب القدر انسان، نئے رنگوں کا پرچم لہراتے ہوئے میرے سامنے ابھر آگیا۔ منٹو سے میری اس دور کی چند ملاقاتیں، ہمارے ایک مشترکہ مارواڑی دوست، نودار کا داس واگا کے دفتر میں ہوئی تھیں۔ ان مجلسوں میں واگا کے علاوہ فلم کے ایک مشہور ہدایت کار، ہمیش کول، اور ایکٹر کشور ساہو بھی شامل رہا کرتے تھے۔ ان مجلسوں میں گفتگو کی نوعیت۔ اکثر و بیشتر، ہمہ گیر ہوا کرتی تھی۔ سیاست ثقافت، نفسیات، مذہبیات سبھی زیر بحث رہا کرتے تھے۔ اور منٹو بڑے عالمانہ اور فاضلانہ وثوق کیساتھ ان مختلف مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کیا کرتا تھا اور میں اس کی ہر بات کو غایت درجہ توجہ کے ساتھ سنا کرتا تھا

منٹو کے علاوہ، انھیں ایام میں، کچھ اور لوگ بھی تھے جنھوں نے مجھ کو بڑی حد تک متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور ان حضرات میں، سید سبط حسن، علی سردار جعفری اور رندیوے کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تینوں سے میری ملاقاتیں، کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں ہوا کرتی تھیں۔ جہاں پر یہ لوگ بڑی تندہی خلوص اور ایثار کے جذبے کے ساتھ ہمہ وقت کام کرتے تھے۔ اگرچہ میرا پارٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور نہ ہی میں کمیونزم کی الف بے سے واقف تھا۔ لیکن دنیا کے حقائق کو سمجھنے اور پرکھنے کا جذبہ ہمیشہ سے میرے دل و دماغ میں کار فرما تھا۔ اس لئے ہر وہ بہت مجھ کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی جہاں مجھے کوئی چراغ نظر آنے لگتا تھا۔ سبط حسن، سردار علی جعفری اور رندیوے اس زمانے میں ہندوستانی دنیائے سرخ کے برگزیدہ رہنما تسلیم کئے جاتے تھے۔ اور میری نظر میں ان کا احترام دوہری باتوں کے علاوہ اس لئے بھی تھا، کہ ان کے فکر و نظر میں اس دور کے لحاظ سے ایک غیر معمولی توانائی اور تیزی تھی۔ میں اگرچہ خود اس قابل نہیں کہ ان کی ذہنی اور علمی سطح پر پہنچ کر ان سے گفتگو کر سکوں۔ تاہم ان کے آپس کے تبادلۂ خیال اور عالمانہ گفتگو کو میں بڑے غور و انہماک کے ساتھ سنتا اور اس سے مستفید ہونے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ لیکن بہت ہی قلیل عرصہ کے بعد میں ان بیش قیمت صحبتوں سے محروم ہوگیا۔ اور اغلباً اس کی وجہ کچھ یہی تھی۔ کہ یہ لوگ برطانیہ سرکار کی قید میں ڈال دیئے گئے تھے۔ یا پھر یہ لوگ انڈر گراؤنڈ چلے گئے تھے۔ بہرحال اس تمام صورت حال کا نچوڑ یہ تھا۔ کہ مجھے، مارکسزم سے واقف کار ہونے کا احساس شدت سے محسوس ہونے لگا۔ اور میں نے اس تشنگی کو بجھانے کے لئے کارل مارکس، اینگلز اور لینن کی جو تصنیف ہاتھ لگی اس کو خریدنا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ لیکن ہوا یہ کہ چند گنی چنی باتوں کے سوا مارکسزم ہرگز میری سمجھ میں نہ آسکی۔ اور میں اپنی اس ناکامی کی وجہ سے حد درجہ مایوس اور آزردہ خاطر ہو کے رہ گیا۔

بقیہ : افسانہ

ہے تو ہم بھی، بس جو آپ کے بنگلے سے نکلتی نالی پر بستے ہیں۔ آپ نے تو ہمارے کچے مکان کو گرانے کا منصوبہ بنایا مگر۔ ہمارے دل میں تو آپ کی دیوار کو چھونے کا خیال تک نہ آیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کاکی کی طرح کوئلہ پکڑ کر قاضی صاحب کی اجلی دیوار پر کالی کالی گالیاں لکھ دے اور پھر ان کی طرف اشارے کر کر کے قہقہے لگائے ——— لیکن وہ ٹیڑھی ہوئی نہ تھی۔ اس لیے ان کی اجلی دیوار پر ایک قوس نما شکل بنا کر اس میں انگلی گھساتے ہوئے صرف اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی ——— "تیری بیٹی کی . . . ."

حلقۂ قارئینِ "الفتح"

- آپ "الفتح" پڑھتے ہیں
- آپ کے علاقے میں کچھ اور لوگ بھی الفتح پڑھتے ہیں
- آپ آپس میں مل کر ان موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے ہوں گے۔
- آپ اپنے علاقے کے مسائل پر بھی آپس میں گفتگو کرتے ہونگے، کچھ تجاویز بھی آپکے ذہن میں آتی ہونگی۔
- کیا آپ باقاعدگی سے اپنے اپنے علاقے میں مہینے میں ایک بار یا دو بار نہیں مل سکتے۔؟ پھر ہمیں لکھیں کہ آپ نے کیا سوچا، کیا بحث کی، کیا تجاویز پیش کیں۔
- اس طرح مختلف علاقوں کے مسائل اور ان پر اپنے ہم خیال دوستوں کی سوچ بھی سامنے آئے گی۔

ہم پھر سب مل جل کر پورے ملک کے مسائل پر بھی کچھ سوچ سکیں گے اور کچھ رائے قائم کر سکیں گے۔

- ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ "الفتح" کے مرکز سے کوئی صاحب آپ کے حلقے سے تبادلۂ خیال کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں آئیں۔
- آپ کا اس تجویز کے بارے میں کیا خیال ہے؟
- کیا ملک کی سلامتی، عوام کی بہتری، غریب و مفلس عوام کے حقوق کے حصول کیلئے "الفتح" کے قارئین اس طرح ایک ٹھوس اور فعّال کردار انجام نہیں دے سکتے؟
- اپنی سوچ سے مطلع کرنے کے لئے ہمیں لکھیے۔

انچارج حلقۂ قارئین "الفتح"

ہفت روزہ "الفتح"، ۸۷-ڈی، نرسری - کمرشیل ایریا کراچی ۲۹ - فون: ۴۱۲۲۷۴

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
16-23. NOV. 1972